کتابی سلسلہ ۴۹

ترتیب: آصف فرخی

دنیازاد

کتابی سلسلہ

دنیازاد

کتاب ۴۹

وبا نمبر

ترتیب و تالیف

آصف فرّخی

فہرست

پیش لفظ

دنیازاد کا ۴۹واں شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ دنیازاد کتابی سلسلہ تقریباً دو دہائیوں سے ایک موقر جریدے کی حیثیت سے آپ کے سامنے پیش ہوتا رہا ہے، جو میرے ابو آصف فرخی کی تن تنہا عرق ریزی اور محنت کا ثمر ہے۔ حسبِ روایت اس سال کے اوائل میں اُنہوں نے اس شمارے پر کام کا آغاز کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کرونا وائرس کی عالمگیر وبا نے دنیا بھر میں اپنے خون آشام پنجے گاڑنے شروع کر دیے تھے، اور پاکستان بھی ان پنجوں کی گرفت میں آچکا تھا۔ ۱۹۹۹ء سے دنیازاد کی روایت رہی ہے کہ بعض شمارے مخصوص اور اہم موضوعات کے لیے مختص کیے جاتے رہے ہیں، لہٰذا اس مناسبت سے شمارے کو ''وبا نمبر'' قرار دیا گیا تھا۔

اس وبا کو بے مثال عالمی پینڈیمک کا درجہ تو مل ہی چکا تھا اور ابو مختلف سطحوں پر دنیا پر آنے والی اس ناگہانی آفت کے مضر اثرات دنیا بھر کے ادب کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہے میں تھے۔ اس شمارے کی تیاری ان کی کثیر الجہت کاوشوں میں سے ایک ہے۔ کراچی میں جب وبا کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے لاک ڈاؤن یا تالہ بندی کا نفاذ کیا گیا، تب تالہ بندی کے نتیجے میں گزرنے والے شب و روز اور انسانی ذہن پر اس کے اثرات کی اہمیت کے پیشِ نظر اُنہوں نے روزنامچوں کی صنف کو شمارے میں خاص اہمیت کے ساتھ شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس ہی زمانے میں ''تالہ بندی کا روزنامچہ'' کے نام سے انہوں نے ایک ''وی لاگ'' کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ لیکن اس شمارے کی تحاریر روزنامچوں تک محدود نہیں ہیں۔ اِس کے دیگر حصوں میں ابو نے عالمی ادب سے ایسی کیفیات پر موجود تازہ مواد کا انتخاب شامل کیا ہے جس کی روشنی میں اس نئی وبا اور اُس کی ہولناکی کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پرانی یا تصوراتی وباؤں کے تناظر میں لکھی گئی تحریروں کو بھی تلاش کیا جو زمانۂ گزشتہ میں بیماری، اسیری، خوف و ہراس کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان منتخب تحریروں میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادبی شہ پارے بھی شامل تھے، جن کے تراجم کا خاص اہتمام کیا گیا۔

لیکن میرے پیارے ابو کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ابھی تک دل اس حقیقت کو قبول نہیں کر سکا ہے اور اس جملے کو لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتا ہے۔۔۔ مگر مشیتِ ایزدی کے آگے سر جھکانے کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ یکم جون ۲۰۲۰ کا دن ابو کو ہم سب سے بہت دور لے گیا۔ ان کی اچانک وفات نے ان کو کچھ بھی مُہلت نہیں دی اور وہ اپنے کام مکمل نہ کر سکے۔ میرے ابو کی ہمہ جہت شخصیت، ان کا علم وفن، ان کے کام کا معیار اور اس پر ان کا پورا عبور، اور اس کے علاوہ پبلک ہیلتھ کی تربیت اور تجربہ، وہ تمام عوامل تھے جن سے وہ یقیناً ایک شاندار ''وبا نمبر'' نکالتے، جو دنیازاد کے پچھلے شماروں کی روایت کو آگے بڑھاتا۔ گو میں اس قابل تو نہیں، لیکن بحیثیت بیٹی کے میری ذمہ داری ہے کہ میں اپنی بساط بھر کوشش سے اس شمارے کو جس کی ترتیب اور تدوین میرے والد کی مرہونِ منت ہے، اس کو منظرِ عام پر لاؤں۔

اس شمارے میں موجود تمام مواد مئی ۲۰۲۰ کے آخری دنوں اپنی حتمی شکل میں آ چکا تھا۔ ابو نے اپنے ذہن میں شمارے کی ضخامت ۳۰۰ صفحات تک سوچ رکھی تھی، لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش میں آخر تک کئی ادیبوں سے ان کا فرمائش کا سلسلہ جاری تھا جن میں کچھ تراجم کی فرمائشیں بھی شامل تھیں۔ بطور ایڈیٹر اس رسالے کے لیے ابو کا معیار ہمیشہ بلند رہتا تھا، اس لیے بھیجی گئی ہر تحریر، یہاں تک کہ بطور فرمائش لکھوائی گئی چیزیں بھی کبھی شامل ہونے سے رہ جاتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد موصول ہونے والی تحریروں کو ان کے معیار سے دیکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا جو تحریر ان کی نظر سے نہیں گزر سکی اس کو ہم نے شامل نہیں کیا ہے۔ اسی طرح جس تحریر کو وہ شامل کر چکے تھے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ رسالے کا سرورق بھی ابو کا ہی انتخاب ہے، جو انہوں نے اس مقصد کے لیے کمپیوٹر میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ میں نے اور اُن لوگوں نے جنہوں نے اس سلسلے میں میری مدد کی ہے، اس بات کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کی ہے کہ مواد میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہو اور رسالے کی تدوین سابق رسالوں کی روایت برقرار رکھ سکے۔

البتہ ایک روایت اس شمارے میں برقرار نہ رہ سکی۔ وہ ہے ''محفل''۔ ابو نے محفل کے لیے ۴ صفحات سادہ رکھوائے تھے کہ یہ کام وہ ہمیشہ بالکل آخر میں کرتے تھے۔ اُن کے کاغذات میں کچھ نوٹس بھی اس حوالے سے موجود تھے۔ مگر وہ نامکمل اور ناکافی تھے، ابھی ان کو ایک مضمون کی شکل اختیار کرنا تھی۔ کسی اور سے ان خالی صفحوں کو پُر کروانے کے بجائے، ہم نے ''محفل'' کے صفحات کو سادہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا کیونکہ محفل کو سجانے والا ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ ان کی جگہ کوئی نہیں

پوری کر سکتا۔

یہ شمارہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، آصف فرخی کی ترتیب، اُن کی سوچ، اور اُن کی کاوشوں کا پوری طرح عکاس ہے۔ میں شکرگزار ہوں عرفان خان، شیر شاہ سیّد، انعام ندیم، فرخ اقبال، اور طارق فیضی صاحبان کی جن کی مدد اور رہنمائی کے بغیر اس سانحے کے بعد اس شمارے کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔ میں ابو کے ان چاہنے والوں اور دوستوں کی بھی تہِ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے دنیازاد کو مکمل کرنے کے لیے خدمات پیش کی تھیں۔ میں قارئین سے گزارش کرتی ہوں کہ اس شمارے میں کسی بھی طرح کی کمی بیشی کو میری ناتجربہ کاری سمجھ کر درگذر کر دیجیے گا۔

غزل آصف فرخی

کراچی،

محفل

یووال نوح ہریری
ترجمہ: سعید نقوی

کورونا وائرس کے بعد کی دنیا

انسانیت کو اس وقت ایک عالمی بحران کا سامنا ہے۔شاید ہماری نسل کا سب سے بڑا بحران۔ آئندہ چند ہفتوں میں افراد اور حکومتیں جو فیصلے کریں گے وہ شاید آنے والے سالوں میں دنیا کا رویہ بدل دیں۔ وہ نہ صرف ہمارے نظام صحت کو دوبارہ مرتب کریں بلکہ ہماری اقتصادیات، سیاست اور معاشرت کو بھی۔ ہمیں فوری اور فیصلہ کن قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے اقدامات کے طویل المدت اثرات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ مختلف مہیا راستوں میں سے انتخاب کرتے ہوئے ہمیں خود سے پوچھنا چاہیے کہ نہ صرف اس فوری خطرے کا کیسے سد باب کریں گے بلکہ اس طوفان کے گزر جانے کے بعد ہم کیسی دنیا میں رہنا پسند کریں گے۔ یہ طوفان گزر جانے کے بعد بھی یقیناً نسل انسانی برقرار رہے گی، لیکن ہم ایک بہت مختلف دنیا میں ہوں گے۔

بہت سی مختصر مدت کی ایمرجنسی عملیات زندگی کا حصہ بن جائیں گی۔ ایمرجنسی کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ تاریخی عمل کو تیز کر دیتی ہیں۔ وہ فیصلے جو عام حالات میں سالوں کی سوچ بچار اور بحث کے طالب ہوں، چند ساعتوں میں کر لیے جاتے ہیں۔خام اور ممکنہ طور پر خطرناک ٹیکنالوجی بھی اپنالی جاتی ہیں، کیوں کہ بے عملی کا خطرہ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ بڑے پیمانے پر سماجی تجربات کے لیے پورے کے پورے ملک تجرباتی جانوروں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جب سب ہی گھر سے کام کر رہے ہوں، اور صرف ایک فاصلے سے ہی رابطہ کر سکتے ہوں تو کیا ہوتا ہے؟۔ کیا ہوتا ہے جب تمام اسکول اور جامعات صرف آن لائن ہی مہیا ہوں؟ عام حالات میں حکومتیں، تجارتی ادارے اور تعلیمی بورڈ کسی ایسے تجربے پر راضی نہیں ہوتے، مگر یہ عام حالات نہیں ہیں۔

اس بحران میں ہمیں دو اہم ممکنات کا بالخصوص سامنا ہے: پہلا مطلق العنان نگرانی اور شہری اختیار، دوسرا قوم پرستی اور عالمی اتحاد کا۔

زیر جلد نگرانی:

اس عالمی وبا کو روکنے کے لیے تمام آبادی کے لیے چند ہدایات کی اطاعت کرنا لازم ہے۔ اسے دو طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ حکومتیں عوام کی نگرانی کریں، اور ہدایت کی خلاف ورزی پر سزا دیں۔ آج انسانی تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہے کہ ہر فرد کی ہر لمحہ نگرانی کی جاسکے۔ پچاس برس پہلے کے جی بی دو سو چالیس ملین سوویت شہریوں کی دن کے چوبیس گھنٹے نگرانی نہیں کرسکتی تھی۔ نہ ہی کے جی بی یہ امید کرسکتی تھی کہ اکٹھا ہونے والی تمام معلومات کا بامعنی طریقے سے تجزیہ کرسکے۔ کے جی بی انسانی جاسوسوں اور تجزیہ کاروں پر بھروسہ کرتی تھی لیکن ہر شہری کے پیچھے ایک جاسوس لگانا تو ممکن نہیں تھا۔ اب حکومتیں گوشت پوست کے جاسوسوں کے بجائے ہر جگہ موجود کیمرے اور طاقتور الگورِدم استعمال کرسکتی ہیں۔

کورونا وائرس کی عالمی وبا کے خلاف جنگ میں بہت سی حکومتیں ابھی سے نئے جاسوسی اوزار استعمال کررہی ہیں۔ سب سے سامنے کی مثال چین کی ہے۔ فرد کے اسمارٹ فون کی نگرانی کرکے، چہرے شناخت کرنے والے کروڑوں کیمروں کے استعمال سے، اور لوگوں پر یہ پابندی عائد کرکے کہ وہ اپنا درجہ حرارت اور طبی احوال بھیجتے رہیں، چینی حکام فوراً ہی کورونا وائرس کے حامل ممکنہ افراد کو شناخت کرسکتے ہیں، بلکہ ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھ کر ان سے رابطے میں آنے والے افراد کو بھی۔ شہریوں کو موبائل فون پر بہت سے ایپ کے ذریعے مریض کے قرب و جوار سے آگاہ رکھا جاتا ہے۔

اس قسم کی ٹیکنالوجی محض مشرقی ایشیا تک ہی محدود نہیں۔ اسرائیلی وزیر اعظم بنجمن نتن یاہو نے حال ہی میں اسرائیلی سیکرٹ ایجنسی کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کورونا وائرس کے خلاف وہ جاسوسی ٹیکنالوجی استعمال کرے، جسے عام طور پر دہشت گردوں سے جنگ میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ جب متعلقہ پارلیمانی ذیلی کمیٹی نے اس کی منظوری سے انکار کیا، تو نتن یاہو نے ایمرجنسی قواعد کا فائدہ اٹھا کے اسے نافذ کرہی دیا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں نئی بات کیا ہے؟ حالیہ برسوں میں حکومتیں اور کارپوریشن دونوں ہی، بہت نفیس ٹیکنالوجی کے استعمال سے افراد کا تعاقب کرتی، اور افراد کو استعمال کرتی رہی ہیں۔ اگر ہم پھر بھی محتاط نہ ہوئے تو شاید یہ عالمی وبا جاسوسی کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہو۔ نہ صرف اس لیے کہ شاید اس سے بڑے پیمانے پر جاسوسی اوزار ان ممالک میں بھی عام ہوجائیں جو

اب تک انہیں مسترد کرتے رہے ہیں، بلکہ اس لیے بھی ممکن ہے کہ یہ ڈرامائی تبدیلی جاسوسی کو بالائے جلد سے زیر جلد لے جائے۔

ابھی تک جب آپ اپنے فون پر انگلی رکھ کر کسی لنک کو چھوتے ہیں، تو حکومت جاننا چاہتی ہے کہ آپ کی انگلی کیا چھو رہی ہے۔ لیکن کورونا وائرس کے بعد انٹرنیٹ کی توجہ بدل گئی ہے، اب حکومت آپ کی انگلی کا درجہ حرارت اور اس کی جلد کے نیچے خون کا دباؤ معلوم کرنا چاہتی ہے۔

ایمرجنسی پڈنگ:

نگرانی کے معاملات کی چھان بین میں ایک اہم رکاوٹ یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ ہماری نگرانی کیسے ہورہی ہے، اور آئندہ سالوں میں کس چیز کا سامنا ممکن ہے۔ نگرانی کے آلات بہت تیزی سے ایجاد ہورہے ہیں، اور دس سال پہلے جو بات سائنس فکشن تصور کی جاتی تھی، آج وہ باسی خبر ہے۔ ایک فرضی تجربے کے لیے، فرض کیجیے کہ کوئی حکومت اپنے ہر شہری کو پابند کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا کڑا پہنے جو دن کے چوبیس گھنٹے جسم کا درجہ حرارت اور دل کی رفتار ناپ سکے۔ اس سے ملنے والے اعداد وشمار ایک حکومتی الگوردم میں جمع کر کے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ خود آپ کو بھی معلوم ہونے سے پہلے، یہ الگوردم معلوم کرلے گی کہ آپ کب بیمار ہیں، اور یہ بھی کہ آپ کہاں گئے تھے اور کس سے ملے تھے۔ مرض کے پھیلاؤ کے اس سلسلے کو بہت مختصر کیا جاسکتا ہے، بلکہ مکمل طور پر منقطع کیا جاسکتا ہے۔۔ ایک ایسا نظام شاید وبا پر چند ہی دنوں میں قابو پالے۔ یہاں تک تو سب ٹھیک لگتا ہے، درست؟

لیکن ظاہر ہے کہ اس کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ یہ نگرانی کے ایک دہشت انگیز طریقے کو قانونی حیثیت دے رہا ہے۔ مثلاً اگر آپ یہ جانتے ہوں کہ میں سی این این کے بجائے فاکس نیوز کا لنک دبا رہا ہوں، تو اس سے نہ صرف میری سیاسی فکر بلکہ میری شخصیت بھی ظاہر ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر آپ اس بات کی نگرانی بھی کرسکیں کہ جب میں کوئی وڈیو کلپ دیکھتا ہوں تو میرے درجہ حرارت، خون کے فشار اور نبض کی رفتار پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، تو آپ سیکھ سکتے ہیں کہ میں کس بات پر ہنستا ہوں، کس پر روتا ہوں اور کیا بات مجھے بہت غصہ دلاتی ہے۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ غصہ، خوشی، بوریت اور محبت بھی ایسے ہی حیاتیاتی مظاہر ہیں جیسے بخار اور کھانسی۔ وہی ٹیکنالوجی جو کھانسی کو شناخت کرسکتی ہے، قہقہوں کو بھی پہچان سکتی ہے۔ اگر

حکومتیں اور تجارتی کمپنیاں ہمارے حیاتیاتی اعداد و شمار وسیع پیمانے پر جانچنے لگیں تو وہ ہمیں خود ہم سے بھی بہتر سمجھنے لگیں گے۔ وہ نہ صرف ہمارے محسوسات کی پیش گوئی کر سکیں گے بلکہ ان پر اثر انداز بھی ہو سکیں گے۔ وہ جو چاہیں ہمیں فروخت کر سکیں گے، چاہے وہ کوئی صنعت ہو یا سیاست دان۔ حیاتیاتی صفات کی نگرانی سے تو کیمبرج انالٹک نامی کمپنی کے اعداد و شمار میں مداخلت پتھر کے زمانے کی کہانی لگے گی۔ ذرا 2030 کا شمالی کوریا تصور کیجیے، جہاں ہر شہری پر پابندی ہو کہ وہ دن کے چوبیس گھنٹے ایک حیاتیاتی صفات کا کڑا پہنے گا۔ اگر آپ سالار عظیم کی تقریر سنیں اور آپ کے کڑے سے غصے کی معلوم نشانیاں سامنے آئیں تو آپ کا تو کام ہو گیا!

آپ یقیناً حیاتیاتی صفات کی نگرانی کو کسی ایمرجنسی کے دوران صرف عارضی طور پر بھی اپنا سکتے ہیں۔ جب ایمرجنسی گزر جائے تو یہ ختم ہو جائے۔ لیکن ان عارضی اقدامات میں ایمرجنسی گزر جانے کے بعد بھی برقرار رہنے کی بہت بری عادت ہے۔ بالخصوص کیوں کہ ہمیشہ کوئی نئی ایمرجنسی افق پر جھلملا ہی رہی ہوتی ہے۔ مثلاً میرے اپنے وطن اسرائیل نے 1948 کی جنگ آزادی میں ایمرجنسی نافذ کی تھی، جس میں کچھ عارضی اقدامات کی توثیق کی گئی تھی، مثلاً صحافت پر سنسر شپ، زمین کو قومیانہ اور پڈنگ بنانے کے مخصوص قوانین (میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا)۔ وہ جنگ آزادی تو کب کی جیتی جا چکی، لیکن اسرائیل نے وہ ایمرجنسی کبھی ختم نہیں کی، اور 1948 کے عارضی اقدامات میں سے بہت سے برقرار رہے (خدا کے کرم سے ایمرجنسی پڈنگ کا حکم 2011 میں ختم ہو گیا)۔

جب کورونا وائرس کا انفکشن ختم ہو کر صفر رہ جائے گا، تب بھی کچھ حکومتیں یہ اصرار کریں گی کہ وہ حیاتیاتی خصوصیات کی نگرانی برقرار رکھنا چاہتی ہیں کیوں کہ کورونا کی ایک دوسری لہر بھی آ سکتی ہے، یا وسطی افریقہ میں ایبولا کی نئی قسم یا ۔۔۔۔ بات آپ کی سمجھ میں آ ہی گئی ہو گی۔ ہماری خلوت کے بارے میں حالیہ برسوں میں بہت بحث ہوتی رہی ہے۔ یہ کورونا وائرس کا بحران شاید اس جنگ میں ایک جانب پلڑا جھکا دے۔ کیوں کہ جب افراد کو خلوت یا صحت کے درمیان انتخاب کرنے دیا جائے، تو وہ عموماً صحت ہی کو منتخب کرتے ہیں۔

صابن کی پولیس:

افراد سے خلوت یا صحت میں سے ایک کا انتخاب کا مطالبہ ہی دراصل مسئلے کی جڑ ہے، کیوں

کہ یہ ایک غلط انتخاب ہے۔ ہمیں خلوت اور صحت دونوں ہی مہیا ہونی چاہئیں اور ہوسکتی ہیں۔ ہم صحت برقرار رکھنا منتخب کر کے، کورونا وائرس کی عالمی وبا مطلق العنان حکومتوں کی نگرانی کے بغیر بھی روک سکتے ہیں، محض شہریوں کو اختیار دے کر۔ ابھی حالیہ ہفتوں میں کورونا وائرس کی وبا پر قابو پانے کے سب سے کامیاب مظاہر جنوبی کوریا، تائیوان اور سنگاپور میں نظر آئے۔ گو ان ممالک نے کچھ روشوں کی نگرانی تو کی ہے، لیکن ان کا بیشتر انحصار وسیع پیمانے پر بیماری کا امتحان، درست رپورٹ اور آگاہ عوام کے رضامندانہ تعاون پر مشتمل تھا۔

مثلاً صابن سے ہاتھ دھونے کی مثال لیجیے۔ انسانی حفظان صحت کی یہ سب سے اہم دریافت رہی ہے۔ ہر سال یہ سادہ عمل لاکھوں جانیں بچاتا ہے۔ گو آج ہمیں یہ سامنے کی بات لگتی ہے، لیکن یہ صرف انیسویں صدی میں ہی تھا کہ سائنس دانوں نے صابن سے ہاتھ دھونے کی اہمیت دریافت کی تھی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر اور نرسیں ایک عمل جراحی سے دوسرے پر بغیر ہاتھ دھوئے پہنچ جاتے تھے۔ آج اربوں لوگ روزانہ ہاتھ دھوتے ہیں، کسی صابن پولیس کے خوف سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ حقائق سے واقف ہیں۔ میں اپنے ہاتھ صابن سے اس لیے دھوتا ہوں کیوں کہ میں نے وائرس اور بیکٹیریا کے بارے میں سنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جرثومے بیماری کا باعث بنتے ہیں، اور مجھے معلوم ہے کہ صابن انہیں رفع کرتا ہے۔

لیکن اس سطح کے تعاون اور اطاعت کے لیے آپ کو اعتماد کی ضرورت ہے۔ افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائنس، حکومتی اداروں اور ذرائع ابلاغ پر بھروسہ کرسکیں۔ گزشتہ چند سالوں میں غیر ذمہ دار سیاست دانوں نے جان بوجھ کر سائنس، حکومتی اداروں اور ذرائع ابلاغ پر اعتبار کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اب یہی غیر ذمہ دار سیات دان مطلق العنانی پر مائل ہوسکتے ہیں، اس دلیل کے ساتھ کہ لوگوں پر درست قدم اٹھانے کے بارے میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

عام حالات میں جس اعتماد کو برسوں سے ٹھیس لگتی رہی ہو، تو وہ ایک ہی دن میں بحال نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ عام حالات نہیں ہیں۔ بحرانی حالات میں ذہن بھی بہت تیزی سے تبدیل ہوسکتے ہیں۔ آپ کی اپنے بہن بھائیوں سے سالوں تلخ کلامی ہوسکتی ہے، لیکن جب کوئی ایمرجنسی پیدا ہوجائے، تو اچانک آپ محبت اور اعتماد کا ایک پوشیدہ ذخیرہ دریافت کر لیتے ہیں، اور فوراً ایک دوسرے کی مدد کو لپکتے ہیں۔ کوئی نگرانی کا نظام بنانے سے بہتر ہے کہ ہم دوبارہ عوام کا سائنس، حکومتی اداروں اور ذرائع ابلاغ پر اعتماد بحال کریں۔ ہمیں نئی ٹیکنالوجی سے یقیناً استفادہ کرنا چاہیے

لیکن ان سے شہریوں کو بااختیار کیا جائے۔ میں اپنے جسم کے درجہ حرارت اور فشار خون کی نگرانی کے بالکل حق میں ہوں، لیکن ان اعداد و شمار کو کسی مطلق العنان حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے کام نہیں آنا چاہیے، بلکہ ان اعداد و شمار سے مجھے خود اپنے ذاتی فیصلوں میں مدد ملنی چاہیے، اور حکومت کو خود اس کے فیصلوں کے لیے ذمہ دار کیا جانا چاہیے۔

اگر میں دن کے چوبیس گھنٹے اپنی طبی صحت کی نگرانی کرسکوں، تو مجھے معلوم ہوجائے گا کہ کب میں دوسروں کی صحت کے لیے خطرہ بن گیا ہوں، بلکہ یہ بھی کہ میری کون سی عادات میری صحت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر مجھے کورونا وائرس کے بارے میں قابل اعتماد اعداد و شمار مہیا ہوں تو میں یہ تجزیہ کرسکوں گا کہ کیا حکومت سچ کہہ رہی ہے، کیا وہ وبا سے نبٹنے کے لیے درست راہ عمل اپنا رہی ہے۔ جب بھی لوگ نگرانی کی بات کرتے ہیں، تو یاد رکھیے کہ نگرانی کی یہ تکنیک صرف حکومتیں ہی افراد پر استعمال نہیں کرسکتیں، بلکہ ہر فرد بھی حکومت کی نگرانی کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔

تو کورونا وائرس شہریت کا ایک اہم امتحان ہے۔ آنے والے ایام میں ہم میں سے ہر ایک کو سائنسی اعداد و شمار اور صحت کے ماہرین پر بھروسہ کرنا چاہیے، نہ کہ بے بنیاد سازش کے نظریوں اور خود غرض سائنس دانوں پر۔ اگر ہم صحیح انتخاب نہیں کرتے تو اس وہم میں کہ ہماری صحت کی حفاظت صرف اسی طرح ممکن ہے، ہم اپنی اہم آزادیوں سے ہاتھ کھو بیٹھیں گے۔

ایک عالمگیر منصوبے کی ضرورت:

جو دوسرا اہم انتخاب ہمیں درپیش ہے، وہ قوم پرستی یا عالمی بھائی چارہ ہے۔ خود یہ وبا اور اس سے پیدا ہونے والا اقتصادی بحران عالمی مسائل ہیں۔ انہیں صرف عالمی تعاون سے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ اس وائرس کو عالمی سطح پر شکست دینے کے لیے عالمی سطح پر معلومات کا تبادلہ ضروری ہے۔ انسانوں کو وائرس پر یہ اہم فوقیت حاصل ہے۔ چین کا ایک کورونا وائرس اور امریکہ کا کوئی کورونا وائرس ایک دوسرے سے اس معلومات کا تبادلہ نہیں کرسکتے کہ انسانوں کو کیسے مریض بنایا جائے۔ لیکن چین امریکہ کو اس وائرس کے بارے میں کئی اہم سبق سکھا سکتا ہے، اور یہ کہ اس سے کیسے نمٹا جائے۔ میلان میں ایک اطالوی ڈاکٹر جو صبح میں دریافت کرے، اس سے تہران میں شام کے وقت کسی مریض کی جان بچ سکتی ہے۔ جب برطانوی حکومت کئی پالیسیوں کے

درمیان عدم فیصلے کا شکار ہو تو وہ کوریا سے مشورہ کر سکتی ہے، جو ایک ماہ پہلے اسی مسئلے سے دوچار تھا۔ لیکن ایسا ہونے کے لیے ہمیں تعاون اور اعتماد کی عالمی ہم آہنگی درکار ہے۔

ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھلے دل سے معلومات کا تبادلہ کریں، اور عاجزی سے مشورے کے طالب ہوں۔ جو اعداد و شمار اور معلومات انہیں بھیجی جائیں ان پر بھروسہ کریں۔ ہمیں طبی آلات کی پیداوار اور ان کی تقسیم کے لیے بھی ایک عالمی تعاون کی ضرورت ہے۔ بالخصوص مصنوعی تنفس کی مشین اور بیماری کی تشخیص کا امتحان۔ بجائے اس کے کہ ہر ملک انہیں مقامی طور پر بنائے اور ذخیرہ کرے، باہمی تعاون کی ایک عالمی کوشش پیداوار بڑھانے اور ان کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنا سکتی ہے۔ بالکل جیسے ممالک جنگ کے زمانے میں صنعتوں کو قومیا لیتے ہیں، اسی طرح کورونا وائرس کی ضرورت ہے کہ اہم پیداواری صنعتوں کو انسانی ضرورت کی بنیادوں پر مرتب کیا جائے۔ ایک متمول ملک جس میں کورونا وائرس کے مریض کم ہوں، اسے اس بات کے لیے آمادہ ہونا چاہیے کہ قیمتی آلات کسی غریب ملک کو بھیج دے جہاں مریضوں کی تعداد زیادہ ہو۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ جب کبھی اسے ضرورت ہوگی تو دوسرے ممالک اس کی کمک کو آئیں گے۔

ہم طبی عملے کو جمع کرنے کے لیے بھی اسی قسم کی عالمی کوشش کر سکتے ہیں۔ کم متاثرہ ممالک اپنے طبی عملے کو دنیا کے زیادہ متاثرہ ممالک میں بھیج سکتے ہیں، ضرورت کے وقت ان کی مدد کے لیے اور خود بھی قیمتی تجربہ حاصل کرنے کے لیے۔ اگر بعد میں اس وبا کی سمت بدلتی ہے تو یہ امداد الٹے رخ پر بہہ سکتی ہے۔

اقتصادی محاذ پر بھی عالمی تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ اقتصادیات اور فراہمی کے سلسلے (سپلائی چین) کی عالمگیریت کے پیش نظر اگر کوئی حکومت دوسروں کو نظر انداز کر کے، صرف اپنے تئیں ہی کام کرے، تو اس کا نتیجہ محض بدنظمی ہوگا اور بحران مزید گہرا ہو جائے گا۔ ہمیں عالمی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، اور فوری ضرورت ہے۔

ایک اور ضرورت سفر کے بارے میں عالمی تعاون کی ہے۔ مہینوں تک تمام بین الاقوامی سفر پر پابندی سے بہت مشکلات پیدا ہوں گی، اور کورونا وائرس کے خلاف جنگ میں دشواری بھی۔ ممالک کے درمیان باہمی تعاون ضروری ہے، تاکہ کم از کم انتہائی ضروری مسافروں کی سرحد آمد و رفت جاری رہ سکے: مثلاً سائنس دان، ڈاکٹر، صحافی، سیاست دان اور تاجر وغیرہ۔ سفر سے پہلے ہی مسافر کے اپنے وطن میں طبی اسکریننگ کے عالمی معاہدے کے تحت یہ ممکن ہے۔ اگر آپ کو یہ

یقین ہو کہ صرف بہت احتیاط سے اسکرین کیے گئے مسافر ہی جہاز پر سوار ہوئے تھے، تو آپ انہیں اپنے ملک میں زیادہ تپاک سے آنے دیں گے۔

بدقسمتی سے اس وقت ممالک ایسا کچھ نہیں کر رہے۔ بین الاقوامی کمیونٹی مجموعی طور پر مفلوج ہو چکی ہے۔ لگتا ہے کہ اب کمرے میں کوئی بالغ نہیں رہ گیا۔ یہ امید کی جاسکتی تھی کہ برسوں پہلے ہی عالمی رہ نماؤں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ ہوگی تاکہ ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جاسکے۔ جی سیون ممالک اس ہفتے ایک وڈیو کانفرنس ہی منعقد کر سکے ہیں، اور اس میں بھی ایسا کوئی منصوبہ طے نہیں ہوا۔

ایسے سابقہ بحرانوں میں، مثلاً 2008ء کا اقتصادی بحران، یا 2016ء کی ایبولا کی وبا میں امریکہ نے عالمی رہ نما کا کردار ادا کیا تھا۔ لیکن موجودہ امریکی انتظامیہ نے رہ نمائی کا فرض ترک کر دیا ہے۔ اس نے یہ بہت واضح کر دیا ہے کہ اسے صرف امریکہ کی عظمت سے دلچسپی ہے، انسانیت کے مستقبل سے نہیں۔

اس انتظامیہ نے اپنے قریبی دوستوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ جب اس نے یورپی یونین سے سفر پر مکمل پابندی عائد کی تو اس یورپی یونین کو پیشگی اطلاع دینے تک کی زحمت گوارا نہیں کی، اس انتہائی قدم کے بارے میں ان سے مشورہ لینے کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک جرمن دوا ساز کمپنی کو کووڈ 19 (COVID 19) کے نئے ٹیکوں کے مکمل حقوق کے عوض ایک ارب ڈالر کی پیش کش کر کے اس نے جرمنی کو بھی ایک اسکینڈل میں ملوث کر دیا۔ اب اگر موجودہ انتظامیہ بالآخر اپنا رویہ تبدیل کر کے ایک عالمی لائحہ عمل تیار کر بھی لے، تو چند ہی لوگ کسی ایسے رہ نما کے منصوبے پر چلیں گے جو اپنی ذمہ داری کبھی سنجیدگی سے نہ لیتا ہو، جو کبھی اپنی غلطی تسلیم نہ کرتا ہو، جو ہمیشہ کامرانیوں کا سارا کریڈٹ اپنے سر لیتا ہو، لیکن ناکامیوں کا الزام دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہو۔

اگر امریکہ کا چھوڑا ہوا یہ خلا دوسرے ممالک نے پورا نہ کیا، تو نہ صرف موجودہ وبا کو روکنا دشوار ہوگا، بلکہ اس کی میراث آنے والے برسوں میں بھی بین الاقوامی تعلقات میں زہر گھولتی رہے گی۔ پھر بھی، ہر بحران ایک موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ ہم امید کر سکتے ہیں کہ موجودہ وبا سے نوع انساں عالمی عدم اتحاد کے خطرات کو پہچان لے گی۔

اب انسانیت کو انتخاب کرنے کی ضرورت ہے: کیا ہم عدم اعتماد کے راستے پر ہی چلتے رہیں گے یا ہم عالمی اتحاد کا راستہ اپنا لیں گے؟ اگر ہم نے عدم اتحاد منتخب کیا تو اس سے نہ صرف یہ بحران

طوالت اختیار کرے گا بلکہ شاید مستقبل میں اس سے بھی زیادہ تباہی کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر ہم نے عالمی اتحاد کو منتخب کیا تو یہ نہ صرف کورونا وائرس پر فتح ہوگی بلکہ نوع انسانی کو اکیسویں صدی کے مستقبل میں پیش آنے والے بحرانوں اور وباؤں پر بھی۔

فرح ضیاء

دنیا میں کچھ گڑبڑ ہے

یہ کسی خواب جیسا ہے، یوں لگتا ہے جیسے ہم کسی افسانوی جگہ پر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہاں چیزیں کسی کے تخیل کی پرواز کے مطابق وقوع پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ شہری زندگی کا طرہ امتیاز سمجھا جانے والا لامتناہی شور اب کسی پراسرار خاموشی میں بدل چکا ہے۔ وہ شہر، جو یوں لگتا تھا کسی بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، اچانک خالی پن سے بھر گئے ہیں۔ آسمان پھر سے نیلگوں اور ہوا نتھری ہوئی ہے۔ پھول اپنے گردوپیش سے لاپروایوں کھل رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ سورج اپنی موج میں مست پوری آب و تاب دکھاتا ہے اور پھر کسی دن بارش ہولے سے برسنے لگتی ہے۔

طویل عرصے کے بعد گھروں کے اندر افراد خانہ یکجا ہوئے ہیں۔ گلیوں میں بلیاں پہلے سے زیادہ آزادی کے ساتھ آوارگی کرتی یا باہری دیواروں پر کودتی پھاندتی دکھائی دے رہی ہیں۔ کتے سرشام ہی سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ ان کے غول پر رعونت انداز سے ادھر ادھر پھرتے ہیں اور اگر کوئی شخص سڑک پر اس طرح چلتا دکھائی دے جائے جیسے سب کچھ معمول کے مطابق ہے تو یہ اسے بڑی ناگواری اور غصے سے دیکھتے ہیں۔

فرصت کی جن گھڑیوں کو انسان ترستے تھے اب اس کا ایک عمیق سمندر انہیں دستیاب ہو چکا ہے۔ اب تو انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ اپنی اس 'فرصت' کا کیا کریں۔۔ کیوں کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ کچھ چیزیں ایسی بھی وقوع پذیر ہو رہی ہیں جو ہمارے تئیں ٹھیک نہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ نوع انسان کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ افراد، روزگار اور زندگی کو عالمی سطح پر جبری لاک ڈاؤن کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انسان بیماری کے ہاتھوں لاچار ہو کر زندگی کی بازی ہار رہے ہیں۔ اب ہر کسی کو ہر کسی سے خطرہ ہے اور نجات صرف اس میں ہے کہ آپ خود کو ایک چار دیواری کے اندر مقید کر لیں۔ لیکن اس بارے میں بھی یقین سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ چار دیواریاں بھی محفوظ ہیں یا نہیں۔

رات گئے چھتوں پر چڑھ کر دی جانے والی اذانوں کا مقصد نماز کے لیے بلانا نہیں ہے؛ یہ خدا کے سامنے کی جانے والی فریاد ہے کہ وہ ہمیں اس خوفناک بیماری سے نجات دے۔ اخبارات گھروں سے باہر فرش پر اس انتظار میں پڑے رہتے ہیں کہ انہیں پڑھا جائے۔ ہوا پوری طرح سے صاف نہیں ہے۔ یہ اپنے دامن میں شکوک و بیماری کی بوندیں لیے پھرتی ہے، جب جب ہوا چلتی ہے تو اپنے جلو میں اداسیاں لاتی ہے۔ اداسی صرف ان کے لیے نہیں ہے جو گھروں اور ہسپتالوں میں بیماری سے جوجھ رہے اور دم توڑ رہے ہیں یہ اداسی ان کے لیے بھی ہے جنہوں نے اپنا گھر بار اور اپنا روزگار کھو دیا ہے۔ ابھی دُنیا میں ایسی کوئی فریج نہیں بنی جہاں ان کی بھوک کو ذخیرہ کر دیا جائے (سماجی رابطے کی ویب سائٹوں پر اپنے تجرباتی کھانوں کی تصاویر سانجھی کرنے والے لوگ، کیونکہ کھانا پکانے والوں کو تو چھٹی دے دی گئی، وہ بھی اندر ہی اندر اس بھوک سے آگاہ ہیں۔)

میڈیا میں ایسے کچھ لوگوں کی کہانیاں آئی ہیں جو ایک بہتر زندگی اور اچھی خوراک کا خواب آنکھوں میں سجائے اپنے گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آئے تھے لیکن کیسا ستم ہے کہ اب انہیں زندگی اور خوراک کی آس دوبارہ دیہات کی جانب لیے جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے نوع انسانی کو الٹا گیئر لگا دیا ہے۔ دیہاتوں، قصبوں، شہروں اور ملکوں کے مابین موجود سرحدیں اچانک ہی اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ ابھی تک میڈیا اور سوشل میڈیا اپنے بارے میں یہی بتا رہے ہیں کہ وہ محفوظ ہیں۔ میڈیا اچھی اور بری دونوں طرح کی خبریں دیتا ہے لیکن گزشتہ دنوں، ہفتوں اور مہینوں سے اس کے پاس صرف ایک ہی خبر ہے۔ یہ میڈیا ہی ہے جس نے لوگوں کے لیے سرحدیں ختم کر دیں۔ یہی عالمی وبا، مثبت ٹیسٹوں اور اموات کے اعداد و شمار بتا رہا ہے لیکن یہاں صرف بری خبریں ہی نہیں ہیں بلکہ میڈیا ہمیں تندرست ہو جانے والوں کی خبر بھی دے رہا ہے۔ جہاں تک سماجی رابطوں کی ویب سائٹوں کا تعلق ہے تو یہ زیادہ تر خفیہ معجزاتی قسم کے علاج سے بھری پڑی ہیں کیونکہ کوئی بھی اس ممکنہ، اجتماعی اور اچانک دبوچ لینے والی موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس ساری صورتحال نے ہمیں ایک موقع بھی فراہم کیا ہے۔ انسانوں نے فطرت کے ساتھ جس طرح کھلواڑ کیا ہے اس کے بارے میں سوچ بچار کا موقع، یہ سوچنے کا موقع کہ ہم کسی طبقاتی تفریق کے بغیر اس وبا کے سامنے کس قدر بے بس ہیں، انسان ایک دوسرے کے لیے کس قدر لاچار ہیں، انسانی لمس کتنا قیمتی ہے، حفظانِ صحت کے اصولوں کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؛ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا ہم اپنے آپ کو اس نئے معمول کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔

اس خوف وہراس کے ساتھ جو سارے میں پھیلا ہوا ہے، افراد و سماج بیماری سے جوجھتے ملکوں کی اور دیکھ کر اس وبا سے نپٹنے کے لیے طریقہ کار اپنا کر اپنے اپنے اسباق سیکھ رہے ہیں۔ نہ صرف بیماری کا سامنا کرنے کے لیے بلکہ تنہائی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی۔ کچھ نے اس کا حل افسانے میں تلاش کیا ہے تو کچھ شاعری سے رجوع کر رہے ہیں؛ کچھ نے فلسفے میں پناہ تلاشی ہے تو کچھ نفسیات کی گتھیاں سلجھانے لگے ہیں؛ کچھ کی توجہ خوارک پر مبذول ہے تو کچھ خیرات کی جانب متوجہ ہو گئے ہیں۔ یہ فرض کیا جا رہا ہے کہ جلد ہی یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور زندگی واپس معمول پر لوٹ جائے گی۔ کیا ایسا ہو پائے گا؟ یا ہم خود کو اپنے نئے معمول کا عادی بنا لیں گے۔

ایک بار جب یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا تو بطور تہذیب ہم جو اسباق سیکھ چکے ہوں گے وہ نہایت اہمیت کے حامل ہوں گے۔ یہ ایک نادر موقع ہے جو یہ تنہائی ہمیں فراہم کر رہی ہے۔

وبا کے دنوں میں ایک دن کا روز نامچہ

مشورہ دیا جا رہا ہے کہ گھر میں خالی نہ بیٹھو۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہا کرو۔ کتابیں پڑھنے کی بات ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اور کتابوں کی فہرست بھی پیش کر چکے ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کی تفصیل آصف فرخی اور اخبار گارڈین نے مرتب کی ہے۔ لیکن اب کہا جا رہا ہے کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی کرو۔ کچھ نہیں تو اپنا روز نامچہ ہی لکھتے رہا کرو۔ لکھو، کہ آج صبح سے شام تک تم نے کیا کیا؟ اب ظاہر ہے تم سے کوئی ملنے تو آ ہی نہیں سکتا کہ ملنے جلنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ بلکہ گھر کے لوگوں کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ ان سے بھی ذرا فاصلے سے ہی ملو۔ انگریزی میں اسے Respectable Distance کہتے ہیں۔ معلوم نہیں اس کا اردو ترجمہ کیا ہو گا۔ بہر حال، ذرا سوچیے، یہ کیسا مسخرہ پن ہے کہ بیوی کے ساتھ بھی یہ شریفانہ فاصلہ رکھنے کو کہا جا رہا ہے۔

ہاں، تو اب یہ لکھو کہ تم نے صبح کا سورج نکلتے دیکھا یا نہیں؟ اگر دیکھا تو وہ سورج کیسا تھا؟ ویسا ہی تھا جیسے ہر صبح ہوتا ہے یا اس میں کوئی فرق تھا؟ دیکھیے نا، ہم چیزوں کو صرف جسمانی آنکھ سے ہی نہیں دیکھتے بلکہ دل کی آنکھ سے بھی دیکھتے ہیں۔ اور دل کی آنکھ ہمیں وہ دکھاتی ہے جو جسمانی آنکھ نہیں دکھاتی۔ ظاہر ہے، آج کل جب ہم دل کی آنکھ سے سورج کو دیکھیں گے تو وہ بیمار بیمار سا ہی نظر آئے گا۔ یہ جو آج کل نحوست ماری کورونا وائرس کی وبا ہے وہ تو زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ہے۔ بھلا سورج اس سے کیسے بچ سکتا ہے؟۔

ہم نے یہ سوچا، اور طے کیا کہ آج ہم اپنا روز نامچہ لکھنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ہم نے اس مشورے پر عمل کیا۔ صبح ہی صبح کمرے سے باہر نکلے۔ لاؤنج پار کیا اور لان میں پہنچے۔ اب آسمان پر ایک نظر ڈالی۔ موسم نکھرا نکھرا تھا۔ چاروں طرف پھولوں کی مہک تھی۔ بارش میں نہا کر پیڑوں اور پودوں کے ہرے ہرے پتے کچھ اور بھی ہرے ہو گئے تھے۔ اودے، اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے اور لال لال پھولوں کے رنگ کچھ اور بھی شوخ ہو گئے تھے۔ بارش سے کنو مالٹے کے پھول جھڑ گئے تھے۔ اور ہری بھری شاخوں پر چنے کے برابر ننھے ننھے پھل نظر آنے

گئے تھے۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس منحوس وبا نے پیڑوں، پودوں اور پھولوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

ابھی ہم یہ دیکھ ہی رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر ہمیں ڈرا دیا۔ ''یہ بارش فصلوں کے لئے اچھی نہیں ہے۔ گندم کی فصل تیار کھڑی ہے۔ اگلے مہینے کٹائی شروع ہونے والی ہے۔ اس بارش میں گندم کے پودے زمین پر گر جائیں گے۔ اور ان کی بالیوں میں پکے ہوئے گندم کے دانے کالے پڑ جائیں گے۔'' ہم نے یہ بات سنی اور اندر آ گئے کہ ہر سال ہی اس موسم میں بارش ہوتی ہے۔

اس کے بعد نہائے دھوئے، ناشتہ کیا۔ اخبار پڑھے۔ اور لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئے۔ اب دنیا بھر کے اخبار ہمارے سامنے تھے۔ ان اخباروں سے فارغ ہوئے تو فیس بک اور ٹویٹر کا وسیع و عریض میدان ہمیں للچا رہا تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس میدان میں نظروں کے گھوڑے دوڑائے۔ ابھی اس سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ موبائل پر کچھ چوں چاں شروع ہو گئی۔ وٹس ایپ بھانت بھانت کے پیغاموں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ ایسے پیغام تھے جو ہم سے جواب بھی مانگ رہے تھے۔ باقی پیغام ہمارے علم میں اضافے یا ہمارے تھوڑے بہت مبلغ علم میں خلل ڈالنے کے لئے تھے۔ یہ وہ پیغام تھے جنہیں ڈیلیٹ کرتے کرتے ہماری انگلیاں تھک جاتی ہیں۔ مگر ہم انہیں بلاک بھی نہیں کر سکتے کہ ان میں بعض کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں۔ سید قاسم جعفری نے جو دو شعر بھیجے تھے، وہ ہمیں اچھے لگے۔ چلیے، وہ شعر آپ بھی پڑھ لیجے۔

غم کی راتیں ہیں، فنا کے دن ہیں
گریہ و آہ و بکا کے دن ہیں
تم تو پہلے ہی نہیں ملتے تھے
اور پھر اب تو وبا کے دن ہیں

جی ہاں، وبا کے دنوں میں اپنے پیارے ہی زیادہ یاد آتے ہیں۔ اس پر یاد آیا کہ اکادمی ادبیات نے پاکستان کے شاعروں سے کہا ہے کہ اس وبا پر نظمیں اور غزلیں لکھو۔ بہترین تخلیق پر انعام دیا جائے گا۔ دیکھتے ہیں اس مقابلے میں کون کون شاعر حصہ لیتا ہے۔ اور کون بہترین تخلیق کا انعام پاتا ہے۔ نعرے بازی کے لئے بہترین موقع ہے۔ اپنے آصف فرخی افسانہ نگاروں کو بھی اس وبا پر لکھنے کے لئے اکسا رہے ہیں۔ یہاں بھی دیکھیے، کون ہوتا ہے حریف مے مرد

افکن عشق۔ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جوافسانے 11/9 اور دہشت گردی پر لکھے گئے وہ فکشن کم تھے اور فیکشن زیادہ۔اور فیکشن کبھی فکشن نہیں ہوسکتا۔

ہاں تواسی مصروفیت میں دوپہر ہو جاتی ہے۔اب یہ منحوس وبائیں ہوں یا آسمانی اور زمینی بلائیں ،زندہ رہنے کے لئے کھانا تو بہر طور کھانا ہی پڑتا ہے۔کھانا کھایا۔قیلولہ کیا۔اور پھر ٹیلی وژن کے سامنے۔اب ٹی وی ہے اور ہم ۔تیسرے پہر کا آخر ہونے لگتا ہےتو اپنے وزیر اعظم عمران خاں چندٹی وی اینکرز کواپنے سامنے بٹھائے نظرآتے ہیں۔اب یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں رہ گئی ہے۔وہی باتیں جو سن سن کوکان پک گئے ہیں۔اورجنہیں دیکھ دیکھ کرآنکھیں پتھرا گئی ہیں۔اب اس بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ ہماری طرح آپ بھی اپنے وزیر اعظم کو جانتے ہیں۔ اوران کی پھولی ہوئی موٹی کپاسی انا کو بھی جانتے ہیں ۔ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے'' غرور کا سر نیچا''۔لیکن یہ کہاوت شاید ہمارے ہاں تک نہیں پہنچی ہے ۔اس لئے ہر روز ہی ہمیں اس غرور اور تکبر سے ہی واسطہ پڑتا ہے۔ہم نے تو جس گھرانے اورجس ماحول میں تربیت پائی ہے،وہاں بزرگوں کے سامنے اگر کسی کے منہ سے بڑا بول نکل جاتا تھا،تو اس سے کہا جاتا تھا'' میاں ،نیچے کی بین کے کھاؤ''۔یعنی نیچے جو کچھ پڑا ہوا ہے،اسے اٹھاؤ ، اور کھاؤ'' گویا اپنی وقعت اور اپنی قدرو قیمت پہچانو۔

رات کو ہم نے ایک اورفلم دیکھی ۔سیاست کے لئے ٹیلی وژن،علم کے لئے کتابیں ۔اور تفریح کے لئے فلمیں۔لیکن ہم نے اس عرصے میں جوفلمیں دیکھی ہیں ان کا تفریح سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔بلکہ وہ انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کی وہ گتھیاں کھولتی ہیں، جوہمارے تجسس میں اور بھی اضافہ کردیتی ہیں ۔اور ہم اپنی عادت کے مطابق نئے سے نئے سوالوں میں الجھتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں ہم صرف دوفلموں کا ذکر کئے دیتے ہیں ۔یہ دونوں ہندوستانی فلمیں ہیں ۔ایک فلم پانچ چھ سال پرانی ہے ۔ اور دوسری دو تین سال پرانی ۔ایک فلم جس کی کہانی اوراس کا تھیم سانگ ہمیں اب بھی یاد آتا ہےتو سارے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔اس فلم کا نام ہے'' لائف ان میٹرو''۔نام تو انگریزی میں ہے،مگر فلم اردو میں ہے (ہم ہندوستانی فلموں کو ہندی فلم نہیں کہتے، اردو فلم کہتے ہیں) یہاں میٹرو سے مراد ہے،آج کل کے بڑے شہر،جیسے ممبئی ،یا چلئے کہہ لیجے، کراچی(مگرہماری دقیانوسی ذہنیت نے کراچی کوممبئی نہیں بننے دیا) اس فلم میں ہر کردار محبت کی تلاش میں ہے۔یہ محبت صاف ستھری بھی ہے،اور شہوانیت میں لتھڑی ہوئی بھی ۔فلم کاتھیم سانگ

جو ہمیں Haunt کرتا ہے۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے

ان دنوں۔۔۔دل مرا، مجھ سے ہے کہہ رہا

تو بھی جی لے ذرا

ہے تجھے بھی اجازت

تو بھی کر لے محبت

اب یہ لفظ جیسے بھی ہیں۔لیکن اس گانے کی دھن ایسی آسیبی اور Haunting ہے کہ اسے سن کر آپ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے۔اور ایسی ہی اس فلم کی کہانی ہے۔

دوسری فلم کا نام ایسا ہے جس نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ اور ہمیں اپنی ہندی لغت سے رجوع کرنا پڑ گیا تھا۔اس کا نام ہے ''نِ شبدٗ''۔اردو میں یہ نام لکھا ہی نہیں جا سکتا۔یہاں ''نِ'' ن اور ی کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ ن کے نیچے زیر ہے۔ اس کا مطلب ہے لفظوں سے پرے۔یا لفظوں سے ماورا۔یہ ایک ستر بہتّر سال کے آدمی کی کہانی ہے۔ان صاحب کو فوٹو گرافی کا شوق ہے ۔ان کی بیٹی کی سترہ اٹھارہ سال کی ایک سہیلی ان کے گھر آ جاتی ہے۔وہ ایسی شوخ و شنگ لڑکی ہے کہ کسی لمحے بھی آرام سے نہیں بیٹھتی۔وہ صاحب اس کی تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ان تصویروں کے لئے وہ میدانوں، اور پہاڑوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ان کے دل میں اس الہڑ لڑکی لئے کیا جذبات ہیں؟ وہ تو اس کا اظہار نہیں کرتے۔لیکن وہ لڑکی انہیں اپنا بوائے فرینڈ کہتی ہے۔اور ان کے ساتھ وہی سلوک بھی کرتی ہے۔آخر وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہیے۔وہ صاحب بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔اب گھر برباد ہو جاتا ہے۔لیکن فلم کا اختتام ''برعکس''، یعنی بوڑھے کی شہوانی ہوس پر نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صاحب مجبور ہو کر اس لڑکی کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔مگر ان کا گھر تو برباد ہو چکا ہے۔

معاف کیجیے، ہم چلے تھے کہ ایک دن کا روزنامچہ لکھنے، اور رودن کا قصہ سنا دیا۔اب تو ہمیں یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اگر اسی طرح کئی مہینے سارے شہر کا لاک ڈاؤن رہا تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہر روز کی فلم تو دو ڈھائی گھنٹے کی ہوتی ہے، سیاست اور ٹیلی وژن بھی کب تک ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس لئے سوچا ہے کہ اب ہم ULYSSES پڑھنا شروع کر دیں۔یہ ناول ہم نے کئی مرتبہ پڑھنا شروع کیا تھا اور گھبرا کر بیچ میں ہی چھوڑ دیا تھا۔اب سوچا ہے کہ اس ناگہانی وبا کے دنوں میں اسے ختم کر کے ہی دم لیں گے۔

مارگریٹ ایٹ ووڈ
ترجمہ: سید کاشف رضا

سب سے اچھا وقت، سب سے بُرا وقت

کیا آپ کو ایسی کوئی فلم یاد ہے جس میں کوئی نائٹ گھوڑے پر سوار ایک قلعے کی جانب آ رہا ہو اور قلعے کا دروازہ نیچے سے اوپر کو اٹھایا جا رہا ہو اور اس کا سفید گھوڑا عین موقع پر ایک شان دار چھلانگ لگا کر عشق کی اک جست میں قصہ تمام کر دے؟ میں بھی اس کا تصور کر سکتی ہوں لیکن جب میں اس امیج کو ذہن میں لیے انٹرنیٹ پر اسے تلاش کرنے گئی تو وہاں مجھے بس چند کاریں ہی مل سکیں جو اونچے نیچے ہو سکنے والے پُل کے اوپر ہوا میں تیر رہی تھیں یا پھر پنک پینتھر سراغ رساں جو ایسا کرنے میں ناکامی کے بعد کہر آلود پانی میں بے قراری سے بازو مار رہا تھا۔

اس کے باوجود ہم سب ایسے ہی سوار ہیں۔ خوف زدہ کر دینے والا کورونا وائرس ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ ہم اس امید میں فضا میں بلند ہو چکے ہیں کہ ہم دوسری جانب پہنچ جائیں گے جہاں زندگی اس جانب واپس آ چکی ہو گی جسے ہم نارمل یا معمول خیال کرتے ہیں۔ اب جب کہ ہم فضا میں بلند ہیں تو ہم کیا کریں۔ اب اور تب کے درمیان کیا کریں؟

ذرا ان تمام چیزوں کے بارے میں سوچیں جن کے بارے میں ہمیں، امید ہے کہ جب ہم دروازے کے پار قلعے میں پہنچیں گے تو وہ وہاں تب بھی موجود ہوں گی۔ اس لیے آپ سے جو کچھ ہو سکے، اب کر لیجیے تاکہ ان اشیاء کی مستقبل میں موجودگی یقینی بنائی جا سکے۔

اُس قلعے میں ہیلتھ کیئر کارکنوں کو ضرور ہونا چاہیے۔ ہر ایک کو ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کیوں کہ ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ مستقبل کے اس قلعے میں ہم سب کو ایک ہیلتھ کیئر نظام کی ضرورت ہو گی۔ لیکن جب آپ صحت مند تھے تو آپ کی زندگی کو جیے جانے کے قابل کون سی چیز بناتی تھی؟، دوستوں اور اہل خانہ کے علاوہ؟ ہم سب کے پاس اپنی اپنی فہرستیں ہوں گی۔ میری فہرستیں یہ ہیں۔

پسندیدہ ریستوراں اور کیفے: کتنی عجیب بات ہے نا ہم ان خوش گوار مقامات کے بارے

میں یہ سوچتے ہیں کہ وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے تاکہ جب بھی ہمارا جی چاہے ہم ان سے باہر نکل یا ان میں داخل ہو سکیں۔ ان مقامات کو قلعے کے اندر پہنچانے کے لیے وہاں سے کھانا منگوائیں اور ان کے لیے گفٹ سرٹیفیکیٹ خریدیں۔ عام طور پر آپ کو آن لائن معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سی چیز کہاں فروخت کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

آپ کی مقامی کتابوں کی دکان۔ ان میں سے کچھ دکانیں گلی کے نکڑ سے کتاب حاصل کرنے کی پیش کش کرتی ہیں، کچھ گھر پہنچاتی ہیں اور کچھ ڈاک کے ذریعے۔ ان دکانوں کو چلتے رہنے دیجیے۔ اسی شعبے میں ناشرین اور مصنّفین بھی ہاتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر وہ جن کی کتابوں کے موسم بہار میں افتتاح منسوخ کیے جا چکے ہیں۔ اس بارے میں ہر قسم کے حل اختراع کیے جا رہے ہیں: ٹوئٹر پر افتتاح، پوڈ کاسٹ اور مختلف قسم کی ورچوئل تقاریب۔ لوگ آج کل ''قارئین کی برادری'' اور ''مصنّفین کی برادری'' جیسے الفاظ کہنے کے شوقین ہیں جو درحقیقت درست نہیں۔ ایسے بہت سے گروہ اور ادارے ہیں جن میں ہر ایک دوسرے سے دوستانہ رویے کا حامل نہیں ہوتا لیکن آپ ایسے الفاظ کو حقیقی بنا سکتے ہیں۔ جب میں پچیس سال کی تھی تو کینیڈا کی اشاعتی دنیا میں اتنی قلیل سرگرمی ہوتی تھی کہ یہ بات ایک غیر دلچسپ حقیقت بن کر رہ گئی تھی کہ مصنّفین کو دیگر مصنّفین اور اپنے ناشرین کی مدد کرنی چاہیے۔ اور ہم نے ایسا کیا بھی، زیادہ تر، اگرچہ ہم میں سے کچھ باقیوں سے نفرت بھی کرتے تھے۔ ایسی نفرت بھی تو ''برادری'' کا حصہ ہی ہے۔ ذرا کسی چھوٹے سے قصبے میں پوچھ دیکھیے۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں آپ اپنے مقامی دشمنوں کی بھی مدد کرتے ہیں، کیوں کہ اگرچہ وہ الو کے پٹھے ہوں گے مگر وہ آپ کے اپنے الو کے پٹھے ہوں گے۔ ہے نا؟

آپ کے اعتماد یافتہ اخبارات اور میگزین۔ جمہوریت پر دباو روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے اور اگر کسی مطلق العنان سرکار کو شہری آزادیاں، جمہوری آزادیاں اور انسانی حقوق کھڑکی سے باہر اٹھا کر پھینک دینے کی اجازت دے دی گئی تو ایسا بحران پیدا ہوگا جیسا پہلے کبھی دیکھا نہ سنا۔ مطلق العنان سرکار میں اطلاعات اور بحث کا لاک ڈاون بھی کھڑکی سے ان حقوق کو اٹھا کر پھینک دینے کے عمل کا حصہ ہے۔ یہ لازمی ہے کہ مواصلات اور رابطے کی لائنیں کھلی بھی رکھی جائیں اور آزاد بھی۔ اس لیے اخبارات و جرائد کی سبسکرپشن لیں۔ ایسی ویب سائٹ کی حوصلہ افزائی کریں جو جعلی خبروں کا مقابلہ کرتی ہو یا پھر پین امریکا جیسے اداروں کی تقریر کی ذمے دارانہ آزادی کے لیے

جدوجہد کر رہے ہیں۔ عوامی پیسے سے چلنے والے ریڈیو اسٹیشنوں کے لیے چندا دیں۔ ایک وائرس کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ ہماری زبانیں بھی کاٹ ڈالے۔

آرٹ کے ادارے، ہر قسم کے۔ آرٹ کے ذریعے ہم انسانیت کا اظہار کرتے ہیں، انسانیت کے تمام پہلوؤں کا۔ آرٹ کے ذریعے ہم انسانی فطرت کی گہرائیوں تک اتر اور اس کی اونچائیوں تک بلند ہو سکتے ہیں اور اس درمیان میں جو کچھ آتا ہے اسے دیکھ سکتے ہیں۔ تھیٹر، موسیقی، رقص، فیسٹیول، گیلریاں ان سب کو اپنے شو منسوخ کرنے پڑے ہیں۔ ان سب کو نقصان پہنچا ہے۔ انھیں چندہ اور گفٹ سرٹیفکیٹ دیں، ان کی آن لائن تقریبات کے ٹکٹ خریدیں۔ اگر ناظرین ہی نہیں ہوں گے تو بالآخر کوئی آرٹ بھی نہیں ہوگا۔ آپ وہ ناظرین بن سکتے ہیں۔

آپ کا سیارہ۔ ایک ایسا سیارہ جس پر آپ جی سکیں۔ مختصر یہ ہے کہ سمندر کو قتل کر دیجیے تو آپ کی آکسیجن کی رسد ختم ہو جائے گی۔ بہت سے لوگوں نے تبصرہ کیا ہے کہ اس وبا کے دوران عالمی سطح پر خطرناک گیسوں کا اخراج اور آلودگی درحقیقت کم ہو گئی ہے۔ کیا اس کمی کو حقیقت بنانے کے لیے ہم مستقبل کے اس قلعے میں پہلے سے مختلف زندگی گزاریں گے؟ کیا ہم ایندھن اور خوراک کے وسائل کے لیے زیادہ بہتر طریقے اختیار کر سکیں گے؟ یا پھر ہم پہلے جیسے رویوں کی طرف لوٹ آئیں گے؟ سو آپ کسی ایک، دو یا زیادہ ماحولیاتی تنظیموں کا انتخاب کیجیے اور اسے چندا دیجیے۔ ابھی ہی تو آپ کے پاس موقع ہے۔

آخری بات یہ کہ یقین رکھیے۔ آپ دروازے کے پار چھلانگ ضرور لگا سکتے ہیں۔ ہاں، یہ گھڑی خوف ناک اور ناخوش گوار ہے۔ لوگ مر رہے ہیں۔ لوگ نوکریوں سے نکالے جا رہے ہیں اور یہ احساس کہ شاید اپنی زندگیوں پر ان کی گرفت اب ایسی رہ گئی ہے جیسے کسی چٹان کے کنارے پر ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ بیمار نہیں تو پھر چاہے آپ کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہوں اور آپ سوچیں کہ آپ کا ذہن اغوا کیا جا چکا ہے، میں یہی کہوں گی کہ دوسروں کے مقابلے میں آپ ایک بہتر مقام پر ہیں۔

آپ اس وقت سے محظوظ ہو سکتے ہیں مگر ایسی رفتار سے جو اس سے کم جنونی ہوگی جیسے اس وقت تھی جب چیزیں ''معمول'' کے مطابق تھیں۔ اب بہت سے لوگ اس رفتار پر سوال اٹھا رہے ہیں۔ اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت تھی؟ اور فیصلہ کر رہے ہیں کہ وہ اب مختلف طریقے سے جئیں گے۔

ڈکنز کے بقول یہ سب سے اچھا وقت ہے، یہ سب سے بُرا وقت ہے۔ آپ اس وقت کا تجربہ کیسے کرتے ہیں اس کا انحصار، کسی حد تک، آپ ہی پر ہے۔ اگر آپ یہ سب پڑھ رہے ہیں تو آپ زندہ ہیں یا شاید میرا خیال تو یہی ہے۔ اگر آپ زندہ نہیں ہیں تو مجھے شدید حیرت ہوگی۔

اولگا توکارچک
ترجمہ: نجم الدین احمد

کھڑکی سے ایک نئی دُنیا کا نظارہ

میں اپنی کھڑکی میں سے شہتوت کا ایک سفید درخت دیکھ سکتی ہوں--- ایک ایسا درخت، جس کی میں دِلدادہ ہُوں--- جو میرے وہاں رہنے کے فیصلے کا ایک سبب ہے۔ شہتوت ایک سخی درخت ہے--- بہار اور گرما کے تمام موسم کے دوران میں وہ درجنوں مختلف النوع پنچھیوں کو اپنے شیریں اور صحت بخش پھل سے نوازتا ہے۔ ابھی شہتوت پر پتّے دوبارہ نہیں آئے ہیں، بس میں دُور تک سڑک کو دیکھ سکتی ہُوں، جس پر لوگ پارک کی سمت جاتے ہُوئے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ ورٹس واف (Wroclaw) میں موسم لگ بھگ گرم ہو چلا ہے: خیرہ کُن سورج، نیلا آسمان، صاف ہوا۔ آج، جب میں اپنے کُتّے کو ٹہلا رہی تھی، میں نے چتلے کوّے کے جوڑے کو اپنے گھونسلے سے ایک اُلّو کا پیچھا کرتے دیکھا۔ محض چند فٹ کے فاصلے سے، میری اور اُلّو کی ایک دُوسرے سے نظریں چار ہُوئیں۔ لگتا ہے جیسے جانور بھی متوقع طور پر منتظر ہیں کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے۔

طویل عرصے سے، میں محسوس کر رہی ہُوں کہ دُنیا بہت بڑھ گئی ہے۔ بہت زیادہ، بے حد سریع الرفتار، ازحد پُرشور ہو گئی ہے۔ پس، مجھے "صدمۂ تنہائی" کا کوئی تجربہ نہیں ہُوا اور میرے لیے لوگوں کو نہ دیکھنا ازبس دُشوار ہے۔ مجھے اِس پر افسوس نہیں کہ سینما بند ہو گئے ہیں؛ مجھے اِس امر کی بھی قطعاً پروا نہیں کہ مراکز خریداری پر تالے پڑ گئے ہیں۔ تاہم، اِس میں شبہ نہیں کہ جب میں سوچتی ہُوں کہ لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں تو مجھے پریشانی ہوتی ہے۔ لیکن جب مجھے قرنطینہ کے نازل ہونے کا پتا چلا تو میں نے سکون جیسی شے محسوس کی۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگوں کے جذبات ایسے ہی ہوں گے، خواہ اُنھیں اِس پر شرمندگی محسوس ہُوئی ہو۔ میری دروں بینی، طویل محبوس اور مذموم چلبلی بروں بینی از خود ختم ہو کر اپنے خول سے نکل آئی ہے۔

میں اپنے ہمسائے کو کھڑکی میں سے دیکھتی ہُوں، کام کے بوجھ سے چُور ایک قانون دان جسے ابھی میں نے صبح ہی اپنی عدالتی عبا کو کندھے پر لٹکائے اپنے کام پر جاتے ہُوئے دیکھا تھا۔

اب وہ ایک ڈھیلے ڈھالے ٹریک سُوٹ میں ہے، وہ صحن میں ایک شاخ کے ساتھ اُلجھتا ہے؛ یُوں لگتا ہے جیسے وہ چیزوں کو ترتیب سے رکھ رہا ہو۔ میں ایک نوجوان جوڑے کو ایک بڑھے کُتے کو لے جاتے ہُوئے دیکھتی ہوں، جو گذشتہ سرما سے بمشکل چلنے کے قابل رہا ہے۔ کُتا لڑکھڑاتا ہُوا چلتا ہے، جب کہ وہ دونوں نہایت دھیمی رفتار رکھتے ہُوئے صبر و تحمل سے اُس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایک بڑا سا بیلچہ نکال کر، کُوڑے والا ٹرک کُوڑا اُٹھاتا ہے۔

زندگی کسی نہ کسی طور رواں رہتی ہے، لیکن کاملاً ایک مختلف ردھم میں۔ میں نے اپنا کمرہ صاف کیا اور وہ اخبارات نکال لیے جنھیں ہم نے پڑھ کر بازگردانی والی ٹوکری میں رکھ دیا تھا۔ میں نے گُل دان کے پھول بدلے۔ اپنی بائیسیکل اُس دُکان سے لی جہاں اُسے مرمت کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ میں کھانے پکانے میں لطف اُٹھاتی چلی آ رہی ہُوں۔

میرے بچپن کے تصورات اپنی آمد جاری رکھتے ہیں۔ تب بہت وقت ہُوا کرتا تھا، اور اُسے "ضائع" اور "ہلاک" کرنا ممکن تھا۔ گھنٹوں کھڑکی سے باہر تکتے رہنا، چیونٹیوں کا مشاہدہ کرتے رہنا، یا میز کے نیچے لیٹ کر اُسے سفینہ تصور کرنا۔ انسائیکلوپیڈیا کا مطالعہ کرنا۔

کہیں یہ تو نہیں ہُوا کہ ہم زندگی کے نارمل ردھم کی طرف لوٹ آئے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وائرس طرزِ عمل کا خلل بل کہ یکسر پلٹاؤ ہے--- یعنی وائرس کے مقابل آنے والی خلفشار میں مبتلا دُنیا مُعیب تھی؟

وائرس نے ہمیں، آخر کار، وہ شے یاد دلا دی جس کا ہم نہایت شدّ و مد سے انکار کرتے آ رہے تھے: یہ کہ ہم بے حد شکستنی مادے سے بنی نازک مخلوق ہیں۔ یہ کہ ہم مر جاتے ہیں--- یعنی ہم فانی ہیں۔ یہ کہ ہم اپنی "انسانیت" کی بنا پر باقی دُنیا سے الگ نہیں بلکہ دُنیا عظیم جال کی ایک ایسی نوع ہے جس میں ہم پھنسے ہُوئے ہیں اور دُوسری مخلوقات کے ساتھ انحصار پذیری اور اثر اندازی کے نادیدہ دھاگوں سے جُڑے ہُوئے ہیں۔ یہ کہ اس بات سے قطع نظر کہ ہم ایک دُوسرے سے کتنے بعید واقع ممالک میں بستے ہیں، یا ہم کون سی زبانیں بولتے ہیں، یا ہماری جلد کا کیا رنگ ہے، ہمیں یکساں بیماریاں لگتی ہیں، ہمارے خوف یکساں ہیں؛ ہماری موت یکساں ہے۔ اس نے ہمیں احساس دلایا ہے کہ چاہے خطرے کے سامنے ہم اپنے آپ کو کتنا ہی ناتواں اور ضرر پذیر محسوس کیوں نہ کرتے ہوں، ہمارے اردگرد زیادہ ضرر پذیر لوگ موجود ہیں جن کی مدد کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس نے ہمیں یاد دلایا ہے کہ ہمارے بوڑھے والدین اور اُن کے

والدین کس قدر شکستنی ہیں اور اُنھیں ہماری کس قدر دیکھ ریکھ کی ضرورت ہے۔ اس نے ہمیں دکھایا ہے کہ ہماری مجنونانہ حرکات دُنیا کے لیے کتنی خطرناک ہیں۔ اور اس نے ایک ایسا سوال ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے جسے ایک دُوسرے سے پُوچھنے کی ہم میں شاید ہی ہمت ہے: دراصل وہ کیا چیز ہے جس کی کھوج میں ہم جُتے ہُوئے ہیں؟

بیمار پڑنے کے خوف نے ہمیں وہ آشیانے یاد دلا دیے ہیں جن کے ہم باسی ہیں اور جن میں ہم اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ ایسی صُورتِ حال میں، حد یہ کہ نہایت مستقل مزاج مسافر بھی ہمیشہ کسی نہ کسی نوع کے گھر پر زور دیں گے۔ بایں ہمہ، افسردہ سچائیاں بھی ہم پر آشکار ہُوئی ہیں ـــ کہ خطرے کے لمحے میں، ہماری سوچ نے ایک بار پھر محدودیت و اقوام اور سرحدوں کے بلاشرکت غیرے درجات کی طرف مراجعت کی ہے۔ اس مشکل وقت میں، ہم نے دیکھا کہ یورپی یونین کا یورپی قوم کا تصوّر عملی طور پر کس قدر کم زور ہے۔ یوروپی یونین نے قوموں کی ریاستوں کو اِس پُرخطر وقت کے فیصلے ارسال کر کے پیچ کو ضبط کر لیا ہے۔ قدیم شاونیت، ''ہمارا'' اور ''بدیسی'' کی تقسیم اپنے ساتھ لیے، لوٹ آئی ہے ـــ بہ الفاظِ دِیگر، بعینہ وہی جس کے خلاف گذشتہ عشروں میں ہم نے اِس اُمید پر جنگ کی کہ یہ دوبارہ ہمارے ذہنوں کو اُستوار کرے گا۔ وارس کی دہشت عہدِ قدیم کے مانند مجرم قرار دیے جانے کی جانب عود کا باعث بنی ہے یعنی بدیسیوں کو موردِ الزام ٹھیرایا جائے، کہ وہی ہیں جنھوں نے اِس خطرے کو متعارف کروایا ہے۔ یورپ میں وارس ''کہیں اور سے آیا ہے''۔ پولینڈ میں، پردیس سے واپس لوٹنے والا ہر شخص اب مشکوک ہے۔ وارس ہمیں یاد دِلاتا ہے: سرحدیں قائم ہیں، اور عمدگی سے کام کر رہی ہیں۔

مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ وارس ہمیں ایک دِیگر سچائی سے بھی خبردار کرے گا: ہم کتنے زیادہ غیر مساوی ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ نجی جہازوں پر سفر کر کے اپنے جزیروں والے گھروں کو، یا جنگل کی تنہائی میں جا رہے ہیں جب کہ باقی لوگ شہروں ہی میں رہتے ہُوئے بجلی گھروں اور پانی کی ترسیلات چلا رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ، کچھ نے دُکانوں اور ہسپتالوں میں کام کرتے ہُوئے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ کچھ لوگ اِس عالمی وبا سے دولت کما لیں گے جب کہ باقی اپنی تمام جمع پُونجی تک گنوا بیٹھیں گے۔ آنے والا مخدوش وقت تمام اُصولوں کو کھوکھلا کر ڈالے گا، جو ہمیں نہایت مضبوط لگ رہے ہیں: بہت سے دیس اس سے نپٹنے کے اہل نہیں ہوں گے اور اُن کے زوال کے نتیجے میں نئے ضابطے جنم لیں گے جیسا کہ اکثر پُرخطر اوقات کے بعد ہوتا ہے۔

ہمارا یقین ہے کہ ہم گھر تک محدود ہو کر کتابیں پڑھ اور ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہیں، لیکن درحقیقت، ہم اپنے آپ کو ایک نئی حقیقت کی ایسی جنگ کے لیے دوبارہ تیار کر رہے ہیں جس کا ہم ادراک تک نہیں کر سکتے اور جو دھیرے دھیرے سمجھ میں آ رہی ہے کہ کچھ بھی ویسا نہیں رہے گا جیسا ہے۔ لازمی قرنطینہ کی شرط، خاندان کا گھر پر پڑاؤ، شاید ہمیں اُن چیزوں سے آگاہ کر دے جن کا ہم اعتراف نہیں کرنا چاہتے: کہ ہمارا خاندان ہمیں تخفیف کرتا ہے، کہ ہمارے بیاہ کے بندھن عرصہ ہُوئے کاہل پڑ چکے ہیں۔ ہمارے بچے قرنطینہ سے باہر نکلیں گے تو انٹرنیٹ کے منشی ہو چکے ہوں گے، اور ہم میں سے بہت سے، جمود کی طاقت کے باعث، حالات کے، جن میں ہم خُود کار طور پر رہتے ہیں، احمقانہ پن اور فضولیت سے آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ اور کیا خبر، قتال، خُودکشیوں اور ذہنی اختلال کے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے؟

ہماری آنکھوں کے سامنے سے اُس مثالی تہذیبی نمونے کا دُھواں چھٹ رہا ہے جس نے پچھلی دو صدیوں سے ہماری تشکیل کی ہے: کہ ہم تخلیق کے ماہر ہیں، کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، کہ دُنیا ہماری ملک ہے۔ ایک نیا وقت قریب کھنچا چلا آ رہا ہے۔

اورحان پامک
ترجمہ: شہلا نقوی

وبا کے ناول ہمیں کیا سکھاتے ہیں

میں پچھلے چار سال سے ایک تاریخی ناول لکھنے میں مصروف ہوں جو ۱۹۰۱ میں پھیلنے والے طاعون کے بارے میں ہے۔ اس طاعون کو تیسری عالمی وبا قرار دیا گیا تھا۔ اس وبا سے ایشائی ممالک میں کروڑوں اموات ہوئی تھیں لیکن یورپ میں خاصی کم ہوئی تھیں۔ پچھلے چند مہینوں سے میرے دوست اور عزیز، صحافی اور مدیر جو میرے زیرِ تصنیف ناول ''وبا کی راتیں''، کے موضوع سے آگاہ ہیں، مجھ سے عالمی وباؤں کے بارے میں، خصوصاً حالیہ کرونا وائرس کی وبا اور ماضی کی طاعون اور ہیضے کی وباؤں کی مماثلت کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔

انسانی تاریخ اور ادب میں وباؤں کے تذکرے میں جو مماثلت دکھائی دیتی ہے وہ ان کے پیدا کرنے والے جرثوموں اور وائرس کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ ہر دفعہ ہمارا رویہ وبا کے بارے میں ایک سا رہا ہے۔

ہمارا پہلا اقدام ہمیشہ اس سانحے کی تردید کرنا رہا ہے، اس لیے ذمہ دار چاہے قومی حکومتیں ہوں یا علاقائی وہ ابتدائی اقدامات میں دیر لگاتی ہیں، حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہیں اور اعداد و شمار میں من مانی تحریف کر کے وبا کے موجود ہونے سے انکار کرتی ہیں۔

متعدی امراض اور ان کے ضمن میں انسانی طرزِ عمل پر ڈینیل ڈیفو کی تحریر کردہ ''تذکرہ وبا کے سال کا'' سے بہتر شاید ہی کوئی تحریر ہو۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ۱۶۶۴ میں لندن کے مختلف محلوں میں وبا سے اموات کو کم ظاہر کرنے کے لیے متوفین کی موت کے لیے دوسری وجوہات گھڑی جا رہی تھیں۔

۱۸۲۷ میں اطالوی ناول نگار ایلیسانڈرو مینزونی (Alessandro Manzoni) نے اپنے حقیقت نگار ناول "منکوحہ" (Betrothed) میں ۱۶۳۰ میں میلان میں پھیلنے والی طاعون کی

وبا اور اس کی وجہ سے علاقے کے حکام کے خلاف عوام کے غصے کا ذکر کیا ہے۔ میلان کے گورنر نے تمام شواہد کے باوجود وبا کو نظر انداز کیا اور اس سے بچاؤ کی کوششوں پر ایک شہزادے کی سالگرہ کی تقریبات کو ترجیح دی۔ میزونی نے دکھایا ہے کہ طاعون کے تیزی سے پھیلنے کی وجوہات میں ناکافی حفاظتی تدابیر، ان کے نفاذ میں تساہل اور ان پر عوام الناس کا کان نہ دھرنا بھی شامل تھا۔

ادبی تخلیقات جن کا امتیازی پہلو طاعون اور متعدی امراض ہے ان میں عموماً دکھایا جاتا ہے کہ صاحبانِ اقتدار کی لاپرواہی اور غیر محتاط رویہ عوام کے غیظ کا سبب بنتا ہے لیکن بہترین مصنفین مثلاً ڈیفو اور البیر کامو (Albert Camus) سیاست کے علاوہ عوامی اضطراب کے پیچھے چھپے دوسرے عوامل کا بھی احساس دلاتے ہیں۔

ڈیفو کا ناول دکھاتا ہے کہ لوگوں کا غصہ ان کے اپنے مقدر پر بھی ہے، اپنے خدا پر بھی ہے جو ان کی مصیبتوں کو دیکھتا ہے اور ان کی مدد نہیں کرتا، بلکہ شاید یہ وبا اسی کا نازل کیا ہوا عذاب ہے جس کے سامنے چرچ اور پادری سب بے دست و پا ہیں۔

وبا پھیلنے کا دوسرا اثر ہمیشہ افواہوں اور جھوٹی خبروں کا پھیلنا رہا ہے۔ ماضی میں وباؤں کے دوران ناکافی معلومات اور پوری صورتِ حال سے ناواقفیت ان افواہوں کا سبب بنتی تھی۔

ڈیفو اور میزونی بیان کرتے ہیں کہ لوگ راستے میں ایک دوسرے سے ملتے تو فاصلہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس وبا کی ذہنی تصویر کو مکمل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے شہروں اور محلوں کی خیر خیریت بھی پوچھتے تھے۔ ان خبروں سے وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ کون سی جگہ محفوظ ہے جہاں جا کر وہ اپنی جان بچا سکیں گے۔

یہ ایک ایسی دنیا کے تذکرے ہیں جس میں نہ اخبار تھے، نہ ریڈیو، نہ ٹی وی، ناخواندہ عوام کے پاس ان کی اپنی قوتِ متخیلہ کے علاوہ کچھ نہیں تھا جس سے وہ ان خطرات کی سنگینی اور ان سے پیش آنے والے دکھوں کا اندازہ لگا سکتے۔ صرف اپنے تخیل پر انحصار کرنے کی وجہ سے ہر انسان اپنے خوف کا اظہار اپنی مخصوص علاقائی آواز اور توہمات کے راگ میں کرتا نظر آتا ہے۔

وبا کے دنوں میں سب سے عام افواہ کا تعلق اس بات سے تھا کہ طاعون کی وبا کہاں سے آئی اور کس نے پھیلائی۔ اس سال مارچ کے وسط میں جب ترکی میں کرونا کی دہشت پھیلنی شروع ہوئی تو میرے بینک منیجر نے مجھ سے مکمل آگاہی کے لہجے میں کہا کہ "یہ چیز" تو چین نے امریکہ اور ساری دنیا سے معاشی بدلہ لینے کے لیے بنائی ہے۔

ہر ضرر رساں شے کی طرح پلیگ اور وبا کو ہمیشہ خارجی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایک منحوس چیز جو کہیں باہر سے آئی ہے۔ اس کا پہلے کہیں اثر ہوا تھا لیکن وہاں اس کو روکنے کی پوری کوشش نہیں کی گئی۔ تھوسیڈائیڈس (Thucydides) نے جب یونان میں طاعون پھیلنے کا ذکر کیا تو یہاں سے ابتدا کی کہ وبا کی ابتدا بہت دور حبشہ اور مصر میں ہوئی تھی۔

بیماری غیروں کی ہے، باہر سے آئی ہے، بغض و عناد سے پھیلائی گئی ہے۔ سب سے زیادہ پھیلنے والی اور جاری رہنے والی افواہیں ان لوگوں کے متعلق ہوتی ہیں جو اس بیماری کو لے کر آئے تھے۔

"منکوحہ" میں مینزونی ایک کردار پیش کرتا ہے جو قرونِ وسطیٰ سے آج تک لوگوں کے خیالوں کا حصہ بنا ہوا ہے۔ ہر روز کی افواہوں میں اس شیطان صفت ہستی کا ذکر ہوتا ہے جو راتوں کو طاعون زدوں کے مواد سے لوگوں کے دروازوں اور پانی پینے کی جگہوں کو آلودہ کرتا ہے۔ کبھی ایک بوڑھا کسی چرچ کے فرش پر تھک کر بیٹھ گیا تو قریب سے گزرتی عورت نے الزام لگا دیا کہ وہ اپنے کوٹ کو اطراف میں رگڑ کر وبا پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے اور ذرا سی دیر میں ایک خون آشام بھیڑ جمع ہو گئی۔

یہ غیر متوقع اور بے قابو تشدد جس کا ذکر یورپ میں نشاۃ ثانیہ میں لکھے گئے وبا کے تذکروں کیا گیا ہے سنی سنائی باتوں، گھبراہٹ اور سرکشی کی بنا پر محمول تھا۔ مارکس اوریلیاس (Marcus Aurelius) اینٹونین میں ہونے والی چیچک کی وبا کا الزام رومن سلطنت میں رہنے والے عیسائیوں پر رکھتا ہے چونکہ وہ رومن دیوتاؤں کے لیے رسوم اور قربانی میں شریک نہیں ہوتے۔ اگلی وباؤں میں عیسائی یورپ اور مسلم عثمانیہ سلطنت میں یہودیوں پر کنوؤں میں زہر ڈالنے کا الزام لگایا گیا۔

وباؤں کی تاریخ اور ان کے بارے میں لکھا جانے والا ادب ہمیں دکھاتا ہے کہ دکھوں کی انتہا، موت کی دہشت، مابعد طبیعیاتی خوف، اور عوام الناس کے مافوق الفطرت تجربے سب ان کے غیظ اور حکومت کے خلاف ان کے جذبات کے محرک تھے۔

ان تمام پچھلی عالمی وباؤں کی طرح اس بار بھی افواہوں اور قومی، مذہبی، علاقائی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر بے بنیاد الزامات کی بھرمار ہے۔ اور کرونا وائرس کے حالات کے بتدریج بگڑنے میں ان کا بھی اثر ہے۔ سوشل میڈیا پر دائیں بازو کے لکھنے والوں نے ان بے بنیاد باتوں

کو خوب اچھالا۔

اور یہ سب اس کے باوجود ہو رہا ہے کہ اب ہمارے پاس اس عالمی وبا کے بارے میں اتنی قابلِ اعتماد معلومات ہیں جتنی ماضی میں کبھی وبا کے دنوں میں لوگوں کے پاس نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لیے آج کل ہم جو وبا کا خوف محسوس کر رہے ہیں وہ پچھلے ادوار سے مختلف ہے۔ ہماری دہشت افواہوں کی وجہ سے نہیں بلکہ صحیح معلومات کی بنا پر ہے۔

جب ہم نقشوں پر وہ سرخ نقطے دیکھتے ہیں جو ان ملکوں، شہروں کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں وبا پھیل چکی ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے پاس بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ اب ہمیں ڈرنے کے لیے اپنے تخیل کی ضرورت نہیں ہے، اب حقیقت ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہم خبروں میں اٹلی کے چھوٹے چھوٹے شہروں سے بڑی بڑی فوجی گاڑیوں کی قطاروں کو لاشیں لے جاتے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے اپنے جنازے کو دیکھ رہے ہوں۔

جو دہشت ہم محسوس کر رہے ہیں اس میں نہ ہمارے تخیل کو دخل ہے نہ انفرادیت کو اور ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ ہماری زندگیاں کتنی مماثل اور کتنی نازک ہیں۔ خوف، موت کا خوف، ہمیں اپنی تنہائی کا احساس دلاتا ہے اور یہ خیال کہ ہم سب ایک سے کرب میں مبتلا ہیں ہمیں ہماری تنہائی سے باہر کھینچ کر انسانیت کا حصہ بنا دیتا ہے۔

یہ خیال کہ سارے انسان، تھائی لینڈ سے نیویارک تک ہماری پریشانیوں میں شریک ہیں، کہ کب اور کہاں ماسک لگانے کی ضرورت ہے، جو سودا خرید کر لائے ہیں اس کو کس طرح استعمال کریں اور کیا اپنے آپ کو قرنطینہ میں رکھیں؟ یہ خیالات ہمہ وقت ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ہم تنہا نہیں ہیں۔ اس سے ایک عجب یکجہتی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بجائے اپنے خوف سے شرمندہ ہونے کے ہمیں ایک عاجزی کا احساس ہوتا ہے جس سے ہمیں دوسروں کے حالات سمجھنے کی تحریک ہوتی ہے۔

جب میں ٹی وی پر دنیا کے سب سے بڑے اسپتالوں کے آگے لوگوں کے جمگھٹے دیکھتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میں بھی اسی دہشت میں مبتلا ہوں جو ساری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیے ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری شرمندگی کم ہو جاتی ہے، مجھے لگتا ہے کہ میرا طرزِ عمل ان حالات میں بالکل درست ہے۔ مجھے وبا کے بارے میں وہ کہاوت یاد آ جاتی ہے کہ جو ڈرتے ہیں وہ زیادہ دنا جیتے ہیں۔

آخرِ کار مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ خوف مجھ میں، اور غالباً ہم سب میں، دو کیفیتیں پیدا کر رہا ہے۔ کبھی میں خاموش، اپنے آپ میں سمٹ کر سب سے الگ ہو جانا چاہتا ہوں اور کبھی ایک عاجزی اور کمال یکجہتی سے سب کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے تیس سال پہلے وبا کے موضوع کو لے کر ایک ناول لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس وقت بھی میں ان حالات سے پیدا کردہ موت کے خوف پر توجہ دینا چاہتا تھا۔ اوجیر غیسلن ڈی بسبیک (Ogier Ghislelin de Busbecq) سلطنتِ عثمانیہ میں شاہ سلیمان کے دورِ حکومت میں سلطنتِ ہاپسبارگ کا سفیر تھا۔ ۱۵۶۱ میں جب استنبول میں طاعون کی وبا پھیلی تو وہ شہر چھوڑ کر ایک جزیرے پر چلا گیا اور اس نے اپنی تصنیفات میں لکھا کہ استنبول میں قرنطینہ کے اصولوں پر سختی سے عمل نہیں کیا گیا چونکہ مسلمان اپنے مذہب کی بنا پر تقدیر کے قائل ہیں۔

ڈیڑھ صدی بعد ڈیفولندن میں طاعون کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ترک اور مسلمان سمجھتے ہیں کہ موت کا وقت مقرر ہے اور قضا و قدر کے یہ فیصلے بدلے نہیں جاسکتے۔

میرا اردہ ہے کہ میں بھی اپنے ناول میں طاعون کے پیدا کردہ حالات میں مسلمانوں کے اس تصور اور اس پر نئے زمانے اور عقلیت کے اثرات پر غور کروں گا۔

ممکن ہے کہ مسلمانوں کا قرنطینہ کو برداشت نہ کرنا ان کے قضا و قدرِ الٰہی پر یقین ہو لیکن یہ مشاہدہ درست ہے کہ عیسائیوں کی بہ نسبت عثمانیہ دور میں مسلمان قرنطینہ کی پابندیاں مشکل سے برداشت کرتے تھے۔ معاشی سرگرمیوں پر حد لگنے سے ہر مذہب کے تاجر دکاندار اور دیہاتی احتجاج کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے احتجاج میں ان کی عورتوں کے پردے کا مسئلہ بھی ہوتا تھا دوسرے یہ کہ کوئی مسلمان، عیسائی طبیب سے علاج کرانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا اور مشکل یہ تھی کہ انیسوں صدی تک سلطنت عثمانیہ میں بھی تقریباً سارے طبیب عیسائی تھے۔

۱۸۵۰ کے بعد دُخانی جہاز میں سفر سستا ہو گیا تھا اور مکے مدینے سے واپس آنے والے حجاج متعدی بیماریاں پھیلانے کا سبب بن گئے۔ اس لیے بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں نے حجاج کی آمد و رفت سے پھیلنے والی بیماریوں کے سدِ باب کے لیے مصر میں دنیا کا سب سے اہم قرنطینہ قائم کیا۔

ان تاریخی عوامل کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں کے تقدیر پر بھروسے کا تصور دنیا میں پھیلا بلکہ اس مفروضے کو بھی فروغ ملا کہ مسلمان اور ایشیائی لوگ ان متعدی بیماریوں کا منبع اور ان کے

پھیلنے کا ذریعہ ہیں۔

فیوڈور دوستوئیوسکی کے ناول "جرم وسزا" میں راسکول نیکوف ادب میں مروجہ خیالات کے تحت ایک وبا کا خواب دیکھتا ہے، "اس نے خواب دیکھا کہ پوری دنیا ایک عجیب وبا کی لپیٹ میں آگئی ہے جو اندرون ایشیا سے یورپ پہنچی ہے"۔

سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں سلطنتِ عثمانیہ کی حدود دریائے ڈانب تک پھیلی ہوئی تھیں، اس کے بعد کا علاقہ مغرب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ان دو دنیاوں کے درمیان ثقافتی اور معاشرتی حدود کا تعین طاعون سے کیا جاتا تھا، یعنی طاعون لگنے کا خطرہ دریائے ڈانب کی مشرق میں زیادہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سب باتوں نے مشرقی اور ایشیائی معاشروں کے مقدر پر مکمل یقین کا خیال مغربی ذہن میں راسخ کر دیا اور یہ مفروضہ بھی کہ ساری وبائیں مشرق کے اندھیرے گوشوں سے ہی نکلتی ہیں۔

ہم پرانے احوال پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شدید وبا کے دنوں میں بھی استنبول کی مسجدوں میں نماز جنازہ ہوتی رہیں، لوگ پرسے کے لیے آتے اور اشکبار ایک دوسرے کے گلے لگتے رہے یہ خیال کیے بغیر کہ یہ بیماری کہاں سے آئی ہے اور کہاں پھیل رہی ہے لوگ اگلے جنازے کے انتظام میں مصروف ہو جاتے۔

لیکن اس دفعہ عالمی وبا میں ترکی کی حکومت نے عقلیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کرونا کی وبا سے مرنے والوں کے جنازوں پر پابندی لگا دی ہے اور نمازِ جمعہ کے اجتماع ممنوع کر دیے ہیں اور ترکوں نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا ہے۔ یہ صرف خوف کا نہیں صبر اور ذہانت کا فیصلہ ہے۔

اس عالمی وبا کے دور کے بعد، ایک بہتر دنیا کو وجود میں لانے کے لیے ہمیں اس عاجزی اور انسانی یک جہتی کو قائم رکھنا ہوگا جو اس وقت کی مشکلات نے ہم میں پیدا کر دی ہیں۔

انتظار حسین

نقار خانے میں طوطی کی آواز

جب سر پہ آکے پڑی تو خدا یاد آیا۔ مگر یہ رویہ ہم سے خاص نہیں۔ یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو یاروں کو خدا یاد آتا ہے۔ مگر ایسے عالم میں مولوی حضرات کو جس طرح خدا یاد آتا ہے اور وہ خلقت کو خدا کی یاد دلاتے ہیں اس کا رنگ دوسرا ہے۔ ابھی جب پچھلے برسوں میں اس ہماری زمین کو ایک سیلاب عظیم نے آلیا تھا اور خلقت گھر در و ڈوبتا چھوڑ کر گوشۂ عافیت کی تلاش میں سراسیمہ پھر رہی تھی تو مولوی حضرات نے یہ وعظ دینا شروع کر دیا کہ لوگو، یہ تمہارے اعمال تمہارے سامنے آرہے ہیں۔ تم نے جو گناہ کئے ہیں، یہ اس کی سزا ہے۔ سو خدا کے قہر سے ڈرو اور توبہ و استغفار کرو۔

مگر اس عمومی وعظ میں اس طرح کی کوئی وضاحت نہیں تھی کہ وہ کون سے گنا یہاں سرزد ہوئے ہیں جس کی یہ سزا ہے اور گنہگار کون لوگ ہیں۔ وعظوں نے چھوٹے بڑوں کو امیروں غریبوں کو، بالانشینوں اور خاک نشینوں کو، سب کو ایک ہی لکڑی ہانکا تھا۔ ہمارے مذہب نے گناہوں کی بھی تو قسم بندی کی ہے۔ ایک موٹی سی تقسیم گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کی صورت میں کی گئی ہے۔ بیچارے غریب غربا گناہ کبیرہ کے تو متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔ جو چھوٹی موٹی اخلاقی کمزوریاں، خطائیں اور لغزشیں ان سے سرزد ہوتی ہیں، انہیں آپ گناہ صغیرہ میں شمار کر لیجئے۔ مگر جسے عذاب الٰہی کہتے ہیں وہ تو روایات کے مطابق بالانشینوں کے کرتوتوں کے نتیجہ میں نازل ہوتا ہے مگر ان کا تو پچھلے سیلاب عظیم میں بھی دامن تک تر نہیں ہوا تھا۔ اب بھی ان کی شان بقول سودا یہ ہے کہ

سودا کی جو بالیں پہ گیا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

پہلے بھی سارا وبال غریب غربا پر پڑا تھا۔ وہی گھر سے بے گھر ہوئے تھے۔ وہی بھوکے ننگے پریشاں حال مارے مارے پھرتے نظر آتیت تھے۔ اب بھی یہی نقشہ ہے کہ موسلا دھار بارشوں میں ان کے کچے پکے گھر ڈھے گئے ہیں، نہیں ڈھے ہیں تو پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہ

لوگ جا بجا کھلے آسمان کے نیچے ڈھیٹ پڑے ہیں۔ یا ڈینگی بخار کی زد میں آ کر یا اس کے خوف سے ہسپتالوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ ایک تو ان کی اپنی مصیبت، دوسرے انہیں یہ کہہ کر ڈرایا جا رہا ہے کہ تم نے بہت گناہ کئے ہیں۔ اس کی سزا تمہیں مل رہی ہے۔

یہ عالم دیکھ کر ہمیں پچھلی مرتبہ بھی ایک ناول، جسے ہم کسی بھلے وقت میں پڑھ کر بھول چکے تھے، بہت یاد آیا۔ اب پھر وہی نقشہ ہے وہ ناول ہمیں پھر یاد آ رہا ہے۔ البرٹ کامیو پیرس میں بیٹھ کر عجب قسم کا ناول لکھ گیا ہے کہ وہ فرانس کی جس صورت حال کا بھی علامتی بیان ہو اس سے بڑھ کر مصیبت زدہ پاکستان کا بیان نظر آتا ہے۔

یہ کامیو کا ناول 'پلیگ' ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ایک بستی میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ موت کا بازار گرم ہے۔ خلقت سراسیمہ ہے۔ اس سراسیمہ خلقت میں سے چند کردار ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک صحافی ہے جو اس سانحہ کی رپورٹنگ کے لئے یہاں آیا تھا مگر اب جبکہ بستی سے نکلنے کے راستے بند ہو چکے ہیں وہ رپورٹنگ کو بھول کر پریشان پھر رہا ہے کہ کسی صورت کسی راستے کسی سواری کے مہیا ہونے پر اس آفت زدہ بستی سے نکل بھاگے۔ مگر اس اندیشہ سے کہ یہاں سے جانے والے اپنے ساتھ یہ بیماری دوسرے ملکوں میں نہ لے جائیں آنے جانے کے سارے وسائل معطل ہیں۔ اور صحافی کا جو سرکاری ذرائع کے ساتھ ربط وضبط ہے وہ اس وقت اس کے کام نہیں آتا۔ اس سے ہٹ کر ایک پادری صاحب ہیں جو لوگوں کو بتا رہے ہیں وہ ڈرا رہے ہیں کہ یہ عذاب ان پر کیوں نازل ہوا ہے۔ ان سے بالکل مختلف ایک اور کردار ہے۔ ایک ڈاکٹر جو اپنی رضا کار ٹیم کے ساتھ بستی بھر میں دوڑتا بھاگتا پھر رہا ہے۔ تن بدن کا ہوش نہیں۔ طاعون کی زد میں آئے ہوئے لوگوں کی دوا دارو میں لگا ہوا ہے۔

پادری کی سنو۔ گرجا گھر میں عقیدت مندوں کا مجمع ہے اور پادری صاحب گرج رہے ہیں ''لوگو، میرے عزیزو، یہ قہر الٰہی ہے جو تمہارے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ خداوند نے کتنا انتظار کیا کہ تم راہ راست پر آ جاؤ۔ مگر تم سمجھ رہے تھے کہ ہمیں خداوند سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب وقت آئے گا تو توبہ کر لیں گے۔ وہ معاف کرنے والا ہے معاف کر دے گا۔ تم نے خداوند کے ساتھ تمسخر کیا۔ اس نے بالآخر اپنا قہر تم پر نازل کیا۔ اسی طرح جس طرح اس نے پچھلی گنہگار امتوں پر اپنا قہر نازل کیا تھا۔ جس طرح اس نے عاد وثمود کی بستیوں پر عذاب بھیجا تھا۔''

پادری صاحب گرج رہے تھے۔ عقیدت مند سرنگوں تھے۔ خوف الٰہی سے لرز رہے تھے

اور توبہ و استغفار کر رہے تھے۔
ڈاکٹر کے واقف کار اس کے پاس جا کر پادری کے اس وعظ کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے سوالات کرتے ہیں اور ڈاکٹر سب سوالوں کا مختصر جواب دیتا ہے ''اس وقت اس لمحہ میں مجھے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا کہ لوگ طاعون کی زد میں ہیں۔ ان کا علاج ہونا چاہیے۔ یہ ان کی فوری ضرورت ہے۔ اور میں اس ضرورت کو پورا کرنے میں جتا ہوا ہوں۔ خدا کرے یہ وبا کسی طرح ٹل جائے۔ اس وقت میں اس سے ہٹ کر کچھ سوچوں گا۔ یہ لوگ بھی اس وقت کچھ سوچنے کے قابل ہوں گے۔ اس وقت تو ان کی ضرورت یہ ہے کہ کسی طرح انہیں اس بیماری سے نجات دلائی جائے۔ اور میں مقدور بھر اس کی کوشش کر رہا ہوں۔

خدا خدا کر کے وبا تھمتی ہے۔ اب کسی کی بغل میں طاعون کی گلٹی نکلتی نظر نہیں آ رہی۔ لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ مگر اب ڈاکٹر کی بغل میں طاعون کی گلٹی نکل آئی ہے۔ علاج معالجہ سے اسے اب فرصت ہے۔ وہ آخری سانس لیتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ گرجا گھر میں پادری کا وعظ جاری ہے۔

راہِ راست پر کون تھا۔ پادری یا ڈاکٹر۔ ناول کچھ نہیں کہتا۔ وہ تو ہمارے لئے ایک لمحہ فکریہ مہیا کر کے ختم ہو گیا۔ باقی ہم خود سوچیں۔ اچھا اور بڑا لکھنے والا اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں سناتا۔ ہمیں سوچنے کی راہ پر ڈال کر چپ ہو جاتا ہے۔ کامیوں بیسویں صدی کے بڑے لکھنے والوں میں سے تھا۔ ایسا کہ ہر بار جب اس ملک پر کوئی آفت ٹوٹتی ہے تو ہم میں سے کتنوں کو جنہوں نے یہ ناول انگریزی ترجمہ میں پڑھا ہے انہیں یہ ناول یاد آتا ہے۔

مگر اب جبکہ پاکستان کی خلقت ایک نہیں کئی کئی آفتوں میں گھری ہوئی ہے، سیلاب کی آفت، ڈینگی بخار کی آفت، دہشت گردی کی آفت، سوچنے سمجھنے والوں کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ یعنی اے اہل نظر سوچو سمجھو ورنہ بقول اقبال ع

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

نور الہدیٰ شاہ

المیہ

(وبا کے دنوں کی کہانی)

زمین پر سکندرِ اعظم کا زمانہ شروع ہوا تھا، جب پہلی مرتبہ وہ کرہِ ارض کا چکر کاٹنے آیا۔

کرہِ ارض کے سبزہ زاروں، سمندروں، دریاؤں، برف پوش پہاڑوں اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں اور وہاں کی مخلوق کے عقل و تدبر کا بہت ذکر سن رکھا تھا اس نے۔ سن رکھا تھا کہ کائنات میں وہ سب سے اشرف مخلوق کہے جاتے ہیں۔ ان کی باتیں سنو تو اپنا ہزاروں گنا طوالت لیے وجود چھوٹا لگنے لگتا ہے، حالانکہ ارض کی مخلوق اپنے قد کاٹھ میں اس کی انگلی کی پور برابر بھی بمشکل ہوگی!

جب وہ اس سیاحت کے شوق میں نکل رہا تھا تو اس کے ایک انتہائی قدیم ساتھی نے اسے راستے میں روک کر خاص طور پر تلقین کی تھی کہ کرہِ ارض پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا۔ دیکھنا، کوئی اشرف مخلوق تمہارے پیروں تلے آ کر کچلی نہ جائے!

اسی نصیحت کی بنا پر وہ جب کرہِ ارض پر اترا تو اس نے اپنے جوتے ارض کے باہر ہی اتار دیے تھے۔

زمین کے حُسن نے اس کے ننگے پیروں کو چھوا تو اس کا فلک کی جانب اٹھتا طویل قامت وجود سرسرا اٹھا۔ اس کے پیروں کو چھوتے گھنے درخت اور پھلوں اور پھولوں کی نرمی، جابجا ہوا کے دوش پر سرد جھنتی ہوئی لمبی لمبی گھاس اور بہتا ہوا پانی، ایک عجب لمس لیے ہوئے تھے!

وہ جھک جھک کر ہر چیز کو حیرت و شوق سے دیکھتا پھرا۔

بادلوں کی نمی سے اس کے قدم مانوس ضرور تھے، مگر یہ کرہِ ارض پر یوں اُمڈ اُمڈ برستے ہیں کہ جابجا ارض کو جل تھل کر دیتے ہیں، یہ اس کے لیے عجب معاملۂ قدرت تھا!

اس نے بڑے ہی رشک کے ساتھ سوچا تھا کہ میری انگلی کی پور جتنی یہ ذرا ذرا سی مخلوق! ان پر اتنی نوازش! حالانکہ وہ تو اس اشرف مخلوق سے کہیں بڑھ کر تھے! ان کی ہزار ہا برس پر محیط عمریں، ٹھہرے ہوئے وقت کی سی طوالت لیے ہوئے ان کا زمانہ، ان کی رفتار، کائنات کی وسعتوں میں

یہاں سے وہاں تک ان کی آمد و رفت، کہکشاؤں میں ان کی گزرگاہیں! ان سب کے سامنے زمین کا یہ گولا تو بہت ہی چھوٹی سی معمولی چیز تھی!

اس نے اپنے قدیمی ساتھیوں سے سن رکھا تھا کہ کرۂ ارض کو کائنات کے سیاروں اور کہکشاؤں کے گنجان جنگلک میں تلاش کرنا بھی بہت مشکل ہے، کیونکہ وہ ان سب کے بیچ ریت کے ایک ذرّے کی مانند کہیں پڑا ملتا ہے، اس لیے وہاں تک کا سفر ایک تلاشِ بسیار ہے گویا!

مگر وہ بالآخر وہاں پہنچ ہی گیا۔

گھومتے گھامتے یونان کی ایک اکیڈمی کے احاطے پر سے اس کا گزر ہوا۔ پتھریلی سیڑھیوں پر ادھیڑ عمر استاد اپنے شاگردوں کے دائرے میں بیٹھا انہیں درس دے رہا تھا۔ گھنے بادلوں کی اوٹ سے جھک کر، بڑی دیر تک وہ انہیں سنا کیا۔

اس نے پہلی بار دکھ والمیے کا معاملہ سنا۔ یہ سنا کہ دکھ اشرف المخلوقات میں ایک کمال کی صورت رکھا ہے جو المیے کی منظر کشی کے ذریعے زندہ رہتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہ لوگ المیہ ڈرامہ بناتے ہیں اور اس پر آنسو بہاتے ہیں!

اُس نے حیرت سے وہاں کے کتب خانے میں رکھی کتابیں دیکھیں اور ادھیڑ عمر استاد کو کتابیں لکھتے ہوئے دیکھا، تو الفاظ کے نقوش نے اسے حیران کر دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کرۂ ارض کی اس مخلوق کو سب سے اشرف کیوں کہا جاتا ہے!

یہیں اس نے سکندر کا ذکر بھی سنا اور پھر سکندر کا دربار بھی دیکھا اور اسے سکندرِ اعظم بنتے بھی دیکھا۔

سکندر کے دربار میں اس پر انکشاف ہوا کہ یہ اشرف مخلوق رتبے میں دراصل ایک جیسی نہیں ہے مٹھی بھر مخلوق، اشرف ہے ورنہ اکثریت کمتر ہے۔ جو اشرف ہے، اس کی مٹھی میں سب کی جان ہے اور اسے دراصل کمزور کا خوف ہی سب سے اشرف بناتا ہے۔ اسی لیے جو اعلیٰ ہے، اس کی گردن اکڑی ہوئی اور چھاتی تنی ہوئی ہے۔ اور جو ادنیٰ ہے، وہ زمین پر اوندھا ہو کر اسے سجدہ کرتا ہے۔

وہ ابھی اسی مشاہدے پر ٹھہرا ہوا ہی تھا کہ سکندر کا لشکر دنیا فتح کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ لشکر نے اسے حیران کر دیا۔ سرپٹ دوڑتے، ہنہناتے، بپھرے گھوڑوں کے سموں کی دھمک اور لشکر کے ہاتھوں میں اٹھے ہوئے قدِ آدم سے اونچے نکلتے نیزے اور زمین کو روندتے لشکر کے

قدموں کی گونج اور آگے آگے رتھ پر سوار سکندر کا جلال!

اس نے حیرت سے دیکھا کہ وہ ہر حسین چیز کو روندے چلے جا رہے ہیں! نازک اندام عورتوں اور بچوں سے آباد بستیاں، جنہیں وہ ابھی نظر بھر دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ تباہ و برباد ہوتی چلی گئیں۔ اس نے پہلی مرتبہ آگ اور خون کا کھیل دیکھا۔ اٹھے نیزوں کی انیوں پر کٹی گردنیں دیکھیں۔ اس حیران کرتی اشرف مخلوق کی آہ و بکا سنی۔ اس نے دیکھا کہ جب کوئی قریہ مکمل برباد ہوکر خون سے تر ہو جاتا ہے، تو سکندر اور اس کا لشکر فتح کا جشن مناتے اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

پتہ نہیں کہاں تک جانا تھا انہیں!

اس نے گردن گھما کر دکھ والیے پر درس دیتے ادھیڑ عمر استاد کی طرف دیکھا تو وہ کتب خانے میں کتابوں پر سر رکھے زار و قطار رو رہا تھا، جیسے یہ کتابیں نہ ہوں، اشرف المخلوقات کی لاشیں ہوں!

یہ سب دیکھ دیکھ کر اس کا دل اوب گیا۔ ہزار ہا برس کی زندگی میں اسے پہلی بار متلی کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ اس کے اندر کی کراہت باہر اُلٹ پڑے گی۔ اس سے پہلے کہ ایسا کچھ ہو جائے، اس نے جلدی جلدی کرۂ ارض کے باہر پڑے اپنے جوتے پہنے اور خلا کی وسعتوں کی طرف لوٹ گیا۔

راہ میں پڑتے سیاروں پر جہاں جہاں ٹھہر کر اس نے قیام کیا، وہاں کی مخلوق کو اپنے اس المناک تجربے سے آگاہ کرتا گیا کہ دیکھ لینا، ایک دن کرۂ ارض کائنات کے اختتام کا سبب بنے گا!

مگر دوسری مرتبہ اسے اپنی محبوبہ کے مسلسل ضد کی وجہ سے اسی کرۂ ارض کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ گو کہ اس نے اپنی محبوبہ کو بہت سمجھایا کہ اب تک تو وہاں کی مخلوق اُس کرے کو مکمل برباد کر چکی ہوگی اور اب وہاں جا بجا ان کی کٹی گردنیں بکھری پڑی ہوں گی۔ کیا تم یہ منظر دیکھنا چاہتی ہو؟

مگر وہ نہ مانی اور بالآخر اسے ہار ماننا پڑی۔

اُنھی کٹی گردنوں کے خیال سے اس نے کرۂ ارض میں داخل ہونے سے پہلے اپنے بھی جوتے اتار دیے اور اپنی محبوبہ کو بھی جوتے اتارنے کو کہا۔ ہوا کا رُخ بحر اوقیانوس کی طرف تھا۔ اوقیانوس کے آبی راستوں پر سے دونوں کا اگلا قدم دریائے ہڈسن کے کنارے جس جگہ پڑا، وہاں گویا حیرت کا ایک عجب جہاں آباد تھا! رنگوں میں تھرکتا ہوا شہر، جس کی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی تھیں۔ مخلوق کا بے کراں انبوہ، جو ایک قدم بھی ٹھہرتا نہ تھا! نہ کسی کی طرف پلٹ کر دیکھتا تھا۔ نہ

کسی کے لیے رکتا تھا!

کرۂ ارض کی اس مخلوق نے ہر طرف آسمان کو چھوتی، دیو ہیکل عمارتوں کا اک جنگل سا بو دیا تھا اور خود ان کے نیچے کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھتے تھے۔ زمین و آسمان پر ان کی بنائی ہوئی مشینوں کا ایک مسلسل شور سا برپا تھا، جس میں ان کی اپنی آوازیں بھی دب کر رہ گئی تھیں، مشینیں جو تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھیں اور طاقت میں بھی ان سے بھاری تھیں۔

اس کی محبوبہ نے بھی کہا کہ جھک کر ذرا غور سے دیکھو تو ایسا لگتا ہے، جیسے کسی کو کسی سے کوئی دلچسپی بھی نہیں! کسی کو کسی کی آواز سننے کی ضرورت بھی نہیں! جیسے سب ہی خواہشوں اور ضرورتوں کے پیچھے دوڑ رہے ہوں اور عجلت میں ان کی سانسیں ان کے قدموں سے بھی تیز تیز چلتی ہوں!

مگر وہ مطمئن تھا کہ اب ان کی گردنیں کٹ کر نہیں گرتیں!

لیکن جب بحرِ اوقیانوس سے گزر کر ان کے قدم بحیرۂ روم کو پھلانگ چکے تو وہ دہل سا گیا۔

جہاں تھا، کھڑا رہ گیا!

وہی برباد ہو چکی بستیاں! جیسے کسی نے فولادی دانتوں سے انہیں چبا چبا کر تھوک دیا ہو!

پناہ گاہ کی تلاش میں اندھا دھند بھاگتے، خون اور راکھ سے لتھڑے لوگ اور ماؤں کو پکارتے وحشت زدہ بچے!

اشرف المخلوقات نے اب ایسے ہتھیار بنا لیے تھے جو زن سے سروں پر سے گزرتے ہوئے، مخلوق کے گھروں اور سروں پر پھٹتے تھے اور آن کی آن میں سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن جاتا تھا۔ اس نے اور اس کی محبوبہ نے ان آتشیں ہتھیاروں کو مٹھی میں جھپٹ کر روکنا بھی چاہا، مگر دونوں کی ہتھیلیاں جل گئیں۔ یہ جلن بھی ان دونوں کے لیے بالکل ہی اجنبی سا تجربہ تھا!

یہ کہہ کر کہ ایسا لگتا ہے کہ کرۂ ارض پر کہیں بھی کوئی پناہ گاہ نہیں ہے، اس کی محبوبہ الٹے قدموں پلٹ گئی کہ اب مزید نہیں دیکھنا اسے یہ ارض۔

انہوں نے اپنے جوتے بحرِ اوقیانوس کی جانب چھوڑے تھے۔ اس لیے واپسی پر بھی انہیں دریائے ہڈسن کے کنارے کھڑا شہر راستے میں پڑتا تھا، جہاں زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ شہر کا شہر روشنیوں میں رقص کی صورت تھرکتا تھا! وہ کرۂ ارض کے نئے سال کی پہلی رات تھی اور اک ہجوم بے کراں تھا جو اپنی اپنی ہستی کی مستی میں مگن تھا اور ان دیکھی لذت سمیٹ رہا تھا۔

دونوں نے ایک آخری نگاہ اشرف المخلوقات پر ڈالی، اور جلی ہتھیلیوں سمیت کرۂ ارض سے

نکل گئے۔

تب بھی اس نے سوچا تھا کہ اب وہ دوبارہ اس طرف کبھی نہ آئے گا۔

مگر چند دن قبل، اسے ایک بار پھر اسی کرۂ ارض کی طرف آنا پڑ گیا ہے۔

اب کی بار اسے اپنے بیٹے کی ضد کی وجہ سے آنا پڑا ہے۔ وہ نئے زمانے کا لڑکا ہے۔ اس کی معلومات کے وسائل اس سے کہیں زیادہ تیز ہیں۔ اسے بیٹے نے ہر طرح سے یقین دلایا ہے کہ کرۂ ارض پر آج کل خاموشی چھائی ہے۔ اس کے دوست بھی ہو آئے ہیں۔ ہر چیز صاف ستھری اور پہلے سے کہیں زیادہ حسین ہو چکی ہے۔ ہر سُو گل کھلے ہیں مگر کوئی میلا ہاتھ انہیں چھو بھی نہیں سکتا۔ پرندے بستیوں میں آزادی سے اُڑتے گنگناتے پھرتے ہیں۔ آسمان اتنا شفاف ہو چکا ہے کہ کہکشاؤں کے اُس پار تک نگاہ جاتی ہے! خوبصورت جانور جنگلوں سے بستیوں کی طرف نکل آئے ہیں، مگر کوئی انہیں شکار نہیں کرتا!

بیٹے کی ضد کے آگے بالآخر وہ مجبور ہو گیا اور اسے کرۂ ارض کی طرف آنا پڑ گیا ہے۔

بحرِ اوقیانوس والا راستہ اسے آج بھی یاد ہے۔ کرۂ ارض میں داخل ہونے سے پہلے اس نے جوتے اتارنا چاہے تو بیٹے نے یہ کہہ کر روک دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ اب کوئی پیروں تلے نہیں آئے گا۔ بیٹے کے کہنے پر وہ جھجکتے ہوئے جوتوں سمیت زمیں کے گولے میں داخل ہو گیا۔

نیلگوں پانیوں کے کنارے وہی شہر، عمارتوں کے جنگل سمیت جوں کا توں موجود تھا اور پانیوں کے بیچ سبز رنگ عورت آج بھی اسی طرح مشعل اٹھائے کھڑی تھی۔ گو کہ وہ دھات سے بنی ہوئی تھی مگر آج جیسے اس پر اسی برس کا بڑھاپا آیا ہوا تھا! جیسے اس کی سانسیں اکھڑ رہی ہوں اور وہ آسمان سے سانسیں مانگ رہی ہو!

اس کی مدد کے لیے اس نے گردن گھما کر شہر کی طرف دیکھا، مگر گلیاں اور سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ گھروں کے باہر پھول کھل اٹھے تھے اور پرندے چہل قدمی کر رہے تھے، مگر دروازے سب ہی گھروں کے بند تھے۔ دیوہیکل عمارتوں تلے عمارتیں کھڑی کرنے والی مخلوق نہ تھی۔ ان کی بنائی ہوئی مشینیں بھی جا بجا دم سادھے بکھری پڑی تھیں۔ نہ اڑتی تھیں۔ نہ چلتی تھیں۔

اسے یقین ہو گیا کہ کرۂ ارض سے بالآخر مخلوق اٹھالی گئی ہے!

اس کے اس خیال پر اس کا بیٹا ہنس دیا۔ کہنے لگا کہ پورے کرۂ ارض کی اشرف المخلوقات کو ایک ایسی بیماری لگ گئی ہے جو ایک میں سے دوسرے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جس سے ان کی

سانسیں کم پڑ جاتی ہیں اور وہ مر جاتے ہیں۔ اب تک ایک دوسرے سے لگی بیماری سے بہت سے مر چکے ہیں۔ باقی کے زندگی بچانے کے لیے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے ہیں کہ کوئی ہمیں چھو نہ لے۔ یہ اب ایک دوسرے کا بوسہ نہیں لے سکتے۔ ایک دوسرے کے بازوؤں میں رقص نہیں کر سکتے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سہارا تک نہیں دے سکتے۔ دکھ اور خوشی میں ایک دوسرے کو گلے نہیں لگا سکتے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر رو نہیں سکتے۔ ان میں سے جو مرنے لگتا ہے، اسے یہ الوداع نہیں کہہ سکتے۔ سمندروں پر اور فضاؤں میں سفر نہیں کر سکتے۔ اب یہ لشکر لے کر کسی بستی پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اب ان کے ہاتھ یوں بندھے ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کے آنسو نہیں پونچھ سکتے اور یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے آنسو بھی نہیں پونچھ سکتے کہ کہیں اپنے ہاتھوں انہیں بیماری نہ لگ جائے! ان کی عبادت گاہوں کے دروازے تک ان پر بند ہو چکے ہیں۔ اب یہ بند گھروں میں تنہا بیٹھے اعتراف کر رہے ہوں گے کہ ہم کوئی ایسی خاص چیز نہیں ہیں!

سنسان پڑے شہر پر چلتے چلتے اس کے بیٹے نے ایک قہقہہ لگا کر کہا، سمجھو اشرف المخلوقات پنجرے میں بند ہے اور کرۂ ارض ان سے آزاد ہو چکا ہے!

اچانک اس کے بیٹے نے پلٹ کر دیکھا کہ اس کا باپ پیچھے رہ گیا ہے اور شہر کے وسط پر ٹھہرا نم آنکھوں سے چاروں اطراف کی ویرانی کو تک رہا ہے!

بیٹے نے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ رو دیا۔

اس کی آنکھوں کے آنسو دیکھ کر بیٹا پریشان ہو گیا۔ ڈر گیا کہ کہیں اس کے باپ کو اشرف المخلوقات میں پھیلی وبا نہ لگ گئی ہو اور یہ آنکھوں کا پانی اسی سبب سے نہ ہو! ورنہ ان کی آنکھوں کا پانی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بیماری ان کے وجود میں ممکن ہی نہیں۔ وہ تو اپنی مقرر حیات مکمل کرتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ بھلا یہ کیسے جان پاتا کہ اس کا باپ کرۂ ارض کی مخلوق کی طرح دکھ کی کیفیت میں مبتلا ہو چکا ہے اور اشرف المخلوقات کے المیے پر آنسو بہا رہا ہے۔

کندھے پر رکھے بیٹے کے ہاتھ کی نرمی نے اس پر منکشف کیا کہ اُس مخلوق کی زندگی سانس میں نہیں، دراصل لمس میں تھی! ایک دوسرے کا لمس!

انہیں ایک دوسرے کا لمس ہی زندہ رکھتا ہوگا!

اس پر منکشف ہوا کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کا سہارا کیسے بنتا ہوگا! کہ کندھے پر رکھا ہاتھ اپنے اندر کیا عجب تسلی لیے ہوئے ہوگا! اور ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر ہی اپنی فنا پذیر

زندگی کو آسان کرتی ہوگی وہ فنا ہو چکی اشرف مخلوق!

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے حیرت زدہ بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا 'اپنی مخلوق کے بغیر یہ کرۂ ارض کچھ بھی نہیں ۔۔ کچھ بھی نہیں ۔۔ اس کا اصل حُسن اس کی مخلوق ہی تو تھی ۔۔ یہ گل وگلزار، صحرا ور سمندر، ہوا، آگ اور پانی! یہ سب اُس مخلوق کے لیے ہی تو تھا ۔۔ وہ ساری مخلوق ایک خاص کشش کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی تھی ۔۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں! ۔۔ اب واپس چلنا چاہیے ۔۔ اب یہ ارض بے کار ہوا ۔۔'

اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے کہ اچانک اس کے بیٹے نے اسے اپنے مظبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے کر نیچے شہر کی طرف اس کا رُخ موڑتے ہوئے کہا 'مگر اشرف المخلوقات تو اب بھی کرۂ ارض پر موجود ہے'

اس نے چونک کر، جھک کر دیکھا کہ سنسان سڑک پر ایک انسان سفید کوٹ پہنے تیز تیز قدم چلا جا رہا ہے۔ بیٹے نے اس کی آنکھوں کا پانی اپنی انگلیوں میں جذب کیا اور کہا 'یہ جو سفید کوٹ والا جا رہا ہے، یہ اشرف المخلوقات کی سانسیں بچانے کا کام کرتا ہے'

وبا، بارش اور بندش

گزر چکے دو دنوں میں تو جیسے جاڑا مڑ کر پھر سے آ گیا تھا اور آتے ہی یوں ہڈیوں میں رچ بس گیا تھا کہ لگا اب یہ جانے کا نہیں۔ اپریل کا مہینہ آ لگا تھا، ہم حکومتی اعلان کے مطابق لاک ڈاؤن کی وجہ سے کمروں، لاؤنج اور حد سے حد باہر پورچ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے مگر دو روز پہلے مطلع بالکل صاف تھا اور سورج اس شدت سے چمکتا تھا کہ باہر کی تپش اندر آتی تھی۔ ایسے میں یہ کیوں نہ سمجھا جاتا کہ لو جاڑا تو گیا۔ ہم بھی یہی سمجھے تھے لیکن ادھر بیگم نے بچوں کی مدد سے گرم کپڑوں کو تہہ کر کے اسٹور میں پھینکوایا اُدھر بادل کی ٹکڑیاں آسمان پر نمودار ہو گئیں اور وہاں سارے میں تہہ بہ تہہ جمع ہوتی گئیں۔ پہلے یخ ہوائیں چلیں، اتنی تند اور تیز کہ صدر دروازے کی ریخوں جولوں کے نہ نظر آنے والے چھیدوں اور جھریوں سے گھر میں گھستی چلی آئیں۔ ہوا کا زور ٹوٹا تو بادل پورے جلال سے گرجنے لگا، بجلی کڑکی اور چھم چھم بارش برسنے لگی۔ اس بارش نے جاتے موسم کو واپس بلا لیا۔ سردی بڑھ گئی تو ہم ٹھٹھرنے لگے۔ ہیٹر دہکایا ہاتھ تاپے مونگ پھلیاں، پکوڑے، سوجی کا حلوہ؛ ہر وہ حیلہ کیا جو اس موسم میں کیا کرتے تھے مگر رگوں میں تو جیسے جما ہوا لہو بہنا بھول گیا تھا۔ مجبوراً ایک ایک کر کے اسٹور میں رکھے گرم کپڑے پھر سے نکال لائے۔ رات بھر مینہ برستا رہتا۔ دن کو کچھ لمحوں کے لیے دھوپ نکلتی تو بھی اندھی، اور لگتا جیسے بدلیاں اوڑھے سورج پورا باہر نکلا تو اسے بھی کپکپی آ لے گی۔ ایسے میں کہ جب یونیورسٹیاں، دفاتر، مارکیٹیں سب بند تھے، بچوں نے گھر میں ہی اپنی مصروفیت کے بہانے ڈھونڈھ نکالے تھے۔ ان دو دنوں میں بھی بچوں کا معمول وہی تھا، ماں کے ساتھ مل کر لڈو یا تاش کھیلنا اور یکسانیت کو توڑنے کے لیے کوئی فلم یا بھلے وقتوں کا کوئی پرانا ڈرامہ دیکھ لینا۔ بس اس میں اگر کچھ بدلا تھا تو یہ کہ کچن میں کچھ اضافی پکنے لگا تھا۔

بچے رات کے پہلے پہر کی نیند کے ہمیشہ سے دشمن تھے۔ رات گئے تک بہانے بہانے سے نیند پرے دھکیلتے رہتے۔ رات بھی ایسا ہی ہوا۔ بیوی بچے لاؤنج میں ہنگامہ کرتے رہے اور میں چپکے سے خواب گاہ میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ لگ بھگ وہی وقت ہو گا کہ جو لوگوں نے کرونا

وائرس کی وبا سے چھٹکارا پانے کے لیے چھتوں پر چڑھ کر اذانیں دینے کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ دور نزدیک سے اذانوں کی آوازیں آتی رہیں پھر ان پر بچوں کے قہقہے حاوی ہو گئے اور میں نیند کی جھیل کے گہرے پانیوں میں اتر گیا۔

میری یہ عادت پختہ ہو چکی ہے کہ رات جلد سو جاتا ہوں اور تڑکے تڑکے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ جی ، جب گھر کے سارے جی گہری نیند میں ہوتے ہیں،تب ۔ بستر چھوڑتے ہوئے مجھے بہت احتیاط برتنا ہوتی ہے کہ بیگم کی سانسوں سے فضا میں ایک خاص آہنگ سا بن جاتا ہے۔اٹھتے ہی نہ جانے کیوں مجھے اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ لگا رہتا ہے لہٰذا چپکے سے بستر سے اترتا ہوں۔ پنجوں کے بل چلتے ہوئے خواب گاہ سے نکلتا ہوں اور دھیرے سے دروازہ بند کر دیتا ہوں ۔ کتاب گاہ میں اترتے ہوئے سیڑھیوں والا قمقمہ بھی روشن نہیں کرتا۔ اس احتیاط کی عطا ہے کہ جب میں اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھتا ہوں تو سانسوں کا یہ آہنگ میرے ساتھ ہوتا ہے جس میں بچوں کے سانس لینے کا آہنگ بھی شامل ہو جاتا ہے کچھ اس تناسب سے کہ مجھے لگتا ہے جیسے پورا گھر سانس لے رہا ہے۔ یہی وہ زندہ تخلیقی ماحول رہا ہے جس میں کاغذ قلم اٹھاتا رہا ہوں تو تخلیق کے لطیف لمحے مجھ پر مہربان ہوتے رہے ہیں۔

وبا کے دنوں کے آتے ہی یہ معمول ٹوٹ گیا تھا کہ اندر کی بے کلی نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی میں اس کیفیت کو گرفت میں نہیں لے پا رہا۔تاہم کچھ لمحے پہلے، جب میں اپنی کتاب گاہ میں اترا، مجھے لگا سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔حکومت کی طرف سے عائد کی گئی لاک ڈاؤن کی پابندی کا دورانیہ آنے والی رات ختم ہو جانا تھا۔ اگرچہ یہ افواہ گردش میں تھی کہ یہ دورانیہ بڑھ سکتا تھا مگر ابھی تک اس باب میں سرکار خاموش تھی۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ میرے اندر کی بندش بھی ٹوٹ گئی تھی۔ میں ماحول سے لطف اندوز ہو سکتا تھا اور ہو رہا تھا۔اس قدر کہ میرے اندر یقین اُتر آیا کہ تخلیقی عمل کو مہمیز لگنے والی تھی۔عین اسی لمحے اچانک میرے سیل سے مدھم سی آواز آئی تھی۔میں چونکا اور نظر سیل کی جانب اُٹھ گئی۔ ابھی ابھی اس کا مانیٹر تھوڑا سا جھلملا کر بجھ گیا تھا۔ وائس ایپ اور ایس ایم ایس پیغامات کی الگ الگ پہچان کے لیے میں نے سیل پر الگ الگ آوازوں کا التزام کر رکھا تھا۔یہ آوازیں بہت مدھم اور مختصر تھیں۔اتنی مدھم اور اتنی مختصر کہ بس اشارہ سا ہوتا۔اس بار جو اشارہ ہوا، وہ ایسی مدھم آواز میں تھا جیسے کسی نے ننھی سی کنکری پانی کے ذخیرے میں گرا دی تھی۔ایس ایم ایس؛ میں جان گیا تھا۔ اچھا، تو کوئی اور بھی تھا جو اس وقت میرے علاوہ

جاگ رہا تھا۔ مجھے کرید لگ گئی، کون؟۔ میرا بے اختیاری میں سیل کی جانب ہاتھ بڑھا اور ایک انگلی سیل کے ڈسپلے کو چھو گئی تو سویا ہوا سیل ایک دم سے جاگ گیا اُٹھا۔ ڈسپلے کے نوٹیفکیشن پر موجود ''کووڈ۱۹'' کے ابتدائی حروف سے میں میسیج کی نوعیت سمجھ سکتا تھا۔ میرا دل وسوسوں سے بھر گیا لہذا پورا میسیج پڑھنے سے قصداً احتراز کرنے کے لیے ہاتھ کھینچ کر انگلیاں ہتھیلی کے اندر موڑ لیں اور مٹھی سختی سے بھینچ لی۔ میں اُس فضا میں رہنا بسنا چاہتا تھا جس میں پورا گھر سانس لیتا تھا۔ میں نے لمبا سانس لیا اور پھیپھڑے پوری طرح بھر لیے۔ پھر ہونٹوں میں اندر کی ہوا دبا دبا کر اور روک روک کر باہر پھینکنے لگا۔ ابھی پوری طرح پھیپھڑے خالی نہیں ہوئے تھے کہ سانس روک لی اور سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے بے دھیانی سے ہونٹ خود بہ خود کھل گئے اور چھاتی نے باقی ماندہ ہوا ایک ہی ہلے میں باہر پھینک دی تھی۔ اب سارے میں گہرا سکوت تھا۔ اتنا گہرا، اور اتنا بوجھل کہ وہاں کہیں کوئی بھی سانس نہیں لے رہا تھا۔ میں بھی نہیں۔ صوفے، میز، الماریاں، الماریوں سے جھانکتی کتابیں، دیواریں، دیواروں پر ٹنگی تصویریں، اوپر جاتی سیڑھیاں، قمقمے سے گرتی روشنی؛ کوئی بھی نہیں۔ محض ایک چھوٹی سی کنکری پڑنے سے سب کچھ بے جان ہو گیا تھا۔

محمد حمید شاہد

وبا کے دِنوں میں اپنا مختیارا

مجھے برسوں بعد اچانک مختیارا یاد آیا تھا۔ جی، اپنے والا مختیارا، وہ نہیں جو وزیر اعظم کے ترجمان ندیم افضل چن کی سوشل میڈیا پر لیک ہو کر وائرل ہونے والی وائس کال کی وجہ سے آپ سمجھ رہے ہیں۔ میری یادداشت والے مختیارے کا تعلق میرے بچپن سے ہے۔ اُن دنوں سے، جب گاؤں میں آنا جانا ہوا کرتا تھا۔ وہ گاؤں جسے ابا چھوڑ کر شہر آ گئے تھے۔ جب ہم وہاں جاتے تو میرا زیادہ تر وقت مختیارے کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس کے باپ کو سب دینا کہتے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کا نام بھی ندیم ہو کہ ایسے ناموں کا ان دنوں گاؤں میں رواج نہ تھا۔ ہاں دین محمد ہو سکتا ہے جو بگڑ کر دینا ہو گیا ہوگا۔ میں انھیں دینا چاچا کہتا تھا اور وہ مجھے محبت سے سمجھایا کرتے تھے کہ میں اُن کے بیٹے مختیارے وڑ جائی وے، کے ساتھ کہیں کوئی ایسا نہ کر بیٹھوں کہ انھیں ملک صاحب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ میرے ابا جی کو ملک صاحب کہتا اور اُن کے سامنے تب تک ہاتھ باندھے مودب کھڑا رہتا تھا جب تک وہ دینے کو بیٹھ جانے کا اشارہ نہ کرتے تھے۔

مختیارے کے ساتھ مل کر میں ایسا ویسا کیا کر سکتا تھا جس سے ابا جی ناراض ہوتے، تب ہمیں اس کا اندازہ نہ ہو پاتا تھا۔ کھیتوں کھیتوں بھاگنا، خربوزے تربوز توڑ کر کھانا اور جو پھیکے نکلیں انھیں وہیں پھینکتے جانا، پیڑوں پر چڑھ کر طوطے مینا کے بچے اُتار لانا۔ کہیں شہد کا چھتا دیکھنا تو لمبی چھڑی اُسے نیچے ہی سے یوں چھبو لینا کہ شہد دھار بناتا نیچے آئے اور جتنا ہم منھ میں بھر سکتے تھے بھر لیں اور آگے نکل جائیں۔ بارانی علاقہ تھا اور بارش کا پانی جن تالابوں میں جمع ہوتا تھا، انھیں مختیارا ڈھن کہتا تھا۔ مال مویشی انہی ڈھنوں سے پانی پیتے تھے۔ کپڑے دھونے ہوتے یا پینے کے لیے پانی سے گھڑے بھرنے ہوتے عورتیں گاؤں کے اوپر والی ڈھن پر آتی تھیں جسے سب نیلی ڈھن کہتے تھے۔ عین دوپہر جب وہاں عورتیں نہ ہوتیں ہم پہنچ جاتے تھے۔ کپڑے اتار کر نیلی کے پانی میں اندر تک گھس جاتے تھے اور ایک دوسرے پر پانی اچھالتے اور خوب چیخیں مارتے تھے۔ تو یوں ہے کہ مختیارے کے ساتھ ایسا وقت گزرا تھا کہ ایک مدت بعد وہ یاد آیا تو اس زمانے کا سارا

ہنگامہ آنکھوں کے سامنے متحرک تصویر کی طرح چلنے لگا تھا۔

اب یہاں یہ وضاحت بھی کردوں کہ مجھے اپنا مختیارا، ندیم چن کی لیک ہونے والی وہ کال سن کر یاد نہیں آیا تھا جس میں اس نے انتہائی بے تکلفی سے اور منھ بھر گالیوں کے ساتھ اپنے مختیارے وڑ جانے دے، کو سیاست کی ماں بہن ایک کرنے کا کہا تھا کہ بات بڑھ گئی تھی۔ کرونا وائرس کی وبا تیزی سے پھیل رہی تھی۔ چن نے اسے بچوں کو گھر کے اندر رکھنے کی تلقین کی اور خود بھی گھر میں ٹک کر بیٹھنے کا کہا تھا کہ اموات زیادہ ہو رہی تھیں جب کہ حکومت بات چھپا رہی تھی۔

وہ جو کہتے ہیں، بندر کے ہاتھ استرا لگنا، تو ایسا ہو گیا تھا۔ سوشل میڈیا کا اُسترا اب ہر ایک کے ہاتھ میں تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر کھچرا اور ٹھٹھے باز یہاں موجود تھا۔ کسی کے ہاتھ یہ کال چڑھی اُس نے میڈیا پر چڑھا دی۔ جو ندیم چن کو نہیں جانتا تھا وہ بھی جان گیا کہ اُس گفتگو نے جو چن چڑھایا تھا سب نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ خبروں میں کم اور عوامی میڈیا پر زیادہ افواہیں گردش میں تھیں کہ بہت زیادہ لوگ وبا سے مر رہے تھے۔ یہ تو باقاعدہ ٹی وی پر بھی نشر ہوا تھا کہ اُدھر کراچی کے علاقے بن قاسم میں کرونا وبا سے مرنے والے شہریوں کو دفنانے کے لیے نیا قبرستان بنالیا گیا تھا۔ 180 ایکڑ پر مشتمل ایک بڑا قبرستان۔ لہٰذا یہ افواہ نہیں خبر تھی۔ خوف زدہ کر دینے والی خبر۔ بتایا گیا تھا کہ اس قبرستان میں وبا سے مرنے والا پہلا شخص دفن بھی ہو چکا تھا۔ ہر ضلع میں تابوت الگ سے تیار کر کے رکھ لیے گئے تھے اور بہ قول ندیم چن، بات بڑھ گئی تھی۔ تاہم جس بات نے اس کی کال کو کھچرے اور مسخرے لوگوں کے ذریعے ہر شخص تک پہنچا دیا تھا وہ ننگی گالیاں تھیں جو بہت محبت میں اور بہت بے تکلفی سے مختیارے وڑ جانے دے، کو دی گئی تھیں۔

لگ بھگ پچاس اکاون برسوں کے بعد مجھے اپنا مختیارا یاد آیا تھا۔ جی، تب نہیں جب سوشل میڈیا پر گالیوں سے سنی ہوئی پوسٹ سُنی تھی یا لوگوں کی اس پر جگتیں اور چوٹیں سنیں اور کارٹون دیکھے تھے، بلکہ تب جب یہی ندیم چن اسی عوامی میڈیا کے لیے بنائی گئی ویڈیو میں معزز بن کر بیٹھا بتا رہا تھا کہ گندم کی برداشت کا موسم آ گیا تھا۔ اس ویڈیو میں وہ لفظ سنبھال سنبھال کر بات کر رہا تھا؛ یوں کہ اس میں سے ساری بے تکلفی منہا ہو گئی تھی۔ تاہم اس ویڈیو والی باتوں میں بھی حد درجہ اخلاص تھا۔ جب اس نے یہ کہا کہ کمبائن ہارویسٹر سے فصل کی کٹائی گہائی کے بجائے کسانوں کو ایک دوسرے کی مدد سے یہ کام کرنا چاہیے تو مجھے کٹائی گہائی کے موسم میں گاؤں میں گزرے دن یاد آ گئے تھے اور اپنا مختیارا بھی۔

صرف مختیارا نہیں، چاچا دیما، چاچی گاہراں اور وہ شام بھی کہ جب میں اور مختیارا کھیتوں کے بیچوں بیچ بارش میں بھیگتے اور پاؤں سے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہوئے گھر پہنچے تھے۔ مختیارے کے گھر۔ جہاں چاچا دیما اور چاچی گاہراں اپنے کوٹھے کے دروازے میں کھڑے آسمان کو دیکھتے تھے اور بار بار کہتے تھے ربا سوہنیا کرم کر اسی تاں پہلے ای موئے مکے آں۔

دو کچے کوٹھوں پر مشتمل یہ گھر، جس کے ایک کوٹھے میں گائے بکری بندھتی تھی اور دوسرے میں پورا گھرانا آباد تھا، اب جو یاد آیا تو سب ایک ہلے میں نہیں، کل سے آج تک کئی قسطوں میں یاد آیا تھا۔ اور یوں تھا کہ میں نے اس گھر اور گھرانے کو گندم کی اس جوان فصل کے ساتھ رکھ کر یاد کیا تھا جو بارش میں بھیگ کر جھکتے جھکتے اپنی جڑوں پر ڈھے رہی تھی اور اس اناج کے ساتھ بھی جسے گمہر نے کڑکا کوڑا کر کے بے کار کر دینا تھا۔ مجھے لگا بھوک ایک پچھل پیری کی طرح اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔ واقعی وہ پہلے سے مرے ہوئے تھے، اور اُن کا یوں تڑپنا، کلپنا اور رب کے حضور بارش رکنے کی رو رو کر التجائیں کرنا اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ میں نے اپنے سینے پر بوجھ محسوس کیا، اُٹھا اور دھیان بٹانے کے لیے ٹی وی آن کر لیا۔ وہاں کوئی سیاہ فام گلوکار انگریزی میں بہت درد بھری آواز میں گا رہا تھا:

''تم کیا جانو سیاہ فام ہونا کیا ہوتا ہے
تم جان ہی نہیں سکتے سیاہ فام ہونا
جب تک تم ایک سیاہ فام گھرانے میں پیدا نہیں ہو جاتے''

میں نے ٹی وی بند کر دیا۔ بارش کی آواز سارے میں گونجنے لگی تھی۔

جب میں سو کر اُٹھا تھا تو مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا بارش کب سے ہو رہی تھی۔ بس اتنا یاد رہ گیا تھا کہ رات جب میں سونے والے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا اور کچھ پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا، شاید تب تک بارش نہیں ہوئی تھی اور اگر بوندا باندی شروع ہو چکی ہو گی تو بھی میں کتاب پڑھنے میں اتنا مگن تھا کہ میرا دھیان اُس طرف نہ گیا ہو گا۔

سونے والے کمرے کی اکلوتی کھڑکی عقبی صحن میں کھلتی تھی۔ پچھلے سال دھوپ بارش سے بچنے کے لیے اُدھر کا جزوی صحن پولی کاربونیٹ شیٹ سے چھت لیا گیا تھا۔ ابھی میں پوری طرح نیند کی گرفت میں تھا کہ ایک آواز وہیں سے، کھڑکی کی ریخوں کے راستے اندر آئی تھی۔

میں نے اپنے بستر پر پہلو بدلا۔ آواز آ رہی تھی، مسلسل جیسے کوئی ایک ہی جملہ دہرائے جاتا

تھا، یا جیسے کوئی بڑبڑاتے ہوئے سسکاری بھر رہا تھا یا پھر جیسے کوئی کسی دوسرے کے کان میں سرگوشی انڈیل رہا تھا۔ تاہم جملے کا ایک ایک لفظ صاف اور سمجھ میں آنے والا تھا۔

''پتر، سارے سکھی گھر ایک سے سکھی ہوتے ہیں لیکن دکھیارے گھرانوں کا دکھ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ بالکل الگ۔''

میں سویا ہوا تھا۔ نہیں شاید میں جاگ گیا تھا مگر میرا ذہن سویا ہوا تھا۔ ممکن ہے میرے ذہن کے اندر کھد بد ہونے لگی تھی اور بدن سویا ہوا تھا۔ جیسا بھی تھا کہیں نہ کہیں کچھ ہو رہا تھا۔ دائیں بائیں دونوں آنکھیں پھڑکنے لگی تھیں۔ آنکھ کے ڈھیلے جیسے اندھیرے میں بند رہ کر اُکتا گئے تھے کہ اندر ہی چکر کاٹنے لگے تھے۔ میں نے ایک بار پھر پہلو بدلا تو گدے کے اسپرنگ چرچرائے۔ اس کے ساتھ ہی مسلسل سنائی دینے والی آواز میں رخنہ پڑ گیا اور میں غنودگی کا خول توڑ کر اُٹھ بیٹھا تھا۔

اب میں عقبی صحن کی چھت پر پڑنے والی بارش کی بوچھاڑ کو پوری طرح پہچان سکتا تھا۔ وہ جو پچھلے صحن کے کھلے حصے پر پڑ رہی تھی اور وہ بھی جو چھتے ہوئے حصے پر تھی۔ وہاں کوئی کھسر پسر تھی نہ سرگوشی، کوئی کسی سے کچھ نہ کہہ رہا تھا۔ ایک بارش کی بوچھاڑ تھی جو دو آوازوں کو مسلسل بہم کر رہی تھی۔ میں نے روشنی کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر سیل فون اُٹھایا اور وقت دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ رات بیگم کو مصروف پا کر میں معمول سے پہلے سونے والے کمرے میں آ گیا تھا۔ شاید اسی لیے جلد آنکھ کھل گئی تھی۔ بیگم ابھی تک بہت گہری نیند میں تھی۔ اب میں اُٹھ گیا تھا تو وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ پاؤں میں چپل اُڑسے، سائیڈ ٹیبل سے کتاب اُٹھائی اور ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ صوفے کے بازو اور پشت سے قرینے سے رکھا گیا کشن اُٹھانے، اُسے سر کے نیچے دبانے اور نیم دراز ہونے سے پہلے میں نے نظر بھر کر سارے میں دیکھا تھا، وہ گھر جو رات کو اندھا بکھرا پڑا تھا صاف ستھرا تھا۔ ہر شے اپنے اپنے مقام پر تھی۔ جب سے وبا کا خطرہ بڑھا تھا بیگم کے کام بھی بڑھ گئے تھے۔ کام میں مدد کے لیے جو خاتون کئی برسوں سے آ رہی تھی لاک ڈاؤن میں نہیں آ رہی تھی اور وہ جو رات دیر سے سونے کی عادی تھی اب گھر کے کام کاج نمٹانے کے لیے قدرے اور تاخیر سے سونے لگی تھی۔

''بے چاری''

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں رات اُس کی کوئی مدد نہیں کر پایا تھا۔ تاہم یہ سوچ کر اپنے آپ

کو تسلی دے لی کہ وہ بھی تو گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ اُسے اچھا لگتا تھا کہ میں پڑھتا لکھتا رہوں۔

میں نے سب سوچیں جھٹک کر کتاب اُٹھالی مگر دھیان بارش کی طرف ہو گیا۔ اب سامنے والے صحن سے بارش برسنے کی آواز آ رہی تھی۔ کل پچھلے پہر تک موسم صاف تھا۔ میں نے باہر پورچ میں کھڑے کھڑے آسمان کی طرف دیکھا تھا، وہاں بادلوں کی ایک دھجی تک نہ تھی۔ مگر اب یوں بارش برس رہی تھی جیسے وہ پچھلی جمعرات سے برستی چلی آتی تھی۔

پچھلی جمعرات کو بھی بارش ہوئی تھی۔ یہ میں نے اندازہ لگایا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنے آپ کو درست کیا۔ نہیں، شاید جمعہ یا ہفتہ تھا وہ۔ میں نے ذہن پر زور دیا اور نئے سرے سے حساب لگایا۔ پچھلی بارش اور اُس سے پچھلی بارش میں کوئی پانچ دنوں کا وقفہ تھا۔ ایسا وقفہ کہ خوب سورج چمکا تھا۔ اس حساب سے بارش ہفتے کو ہوئی تھی مگر میں پھر اُلجھ گیا۔ پانچویں دِن بارش ہوئی تھی یا پانچ دِنوں کے بعد؟ یوں نئے حساب سے وہ اتوار بھی ہو سکتا تھا۔ جب سے حکومت نے وبا سے لوگوں کو بچانے کے لیے تالا بندی اور سماجی فاصلوں کی پابندی کا اعلان کیا تھا سارے دِن ایک جیسے ہو گئے تھے۔ اُکتاہٹ سے بھرے ہوئے چھٹی کے دِن۔ رُکے ہوئے اور سہمے ہوئے دِن۔ چیختی چنگھاڑتی دوڑتی بھاگتی ریل جیسی زندگی کو ایک نہ نظر آنے والے کورونا نامی وائرس نے زنجیر کھینچ کر بریک لگا دی تھی۔ بڑے بڑے سٹور بند تھے، ریل گاڑیاں، جہاز، سینما ہال، عبادت گاہیں سب بند تھے۔ کچھ برسوں سے جگہ جگہ عالی شان مال کھل گئے تھے جہاں ہر برانڈ کا مہنگا مال بکتا تھا جسے خوش حال گھرانوں والے ہنسی خوشی خریدا کرتے کہ بڑے گھرانوں میں اسی کا چلن تھا۔ اب جو سب کچھ بند تھا تو ایک کے بعد دوسرا دِن کیسے ترتیب سے چلتا رہتا۔ میں جوں جوں حساب کرتا یہ بدک سرک کر آگے پیچھے ہو جاتے۔ میں نے سر جھٹک دیا اور تخمینے لگانے سے باہر نکل آیا۔

باہر بارش مسلسل برس رہی تھی، اور شاید اس کے برسنے کی شدت میں اضافہ بھی ہو گیا تھا۔

مجھے یاد آیا جب بچپن میں اس طرح بارش برستی تھی تو اماں کہتی تھیں، جمعرات کی جھڑی ہے اگلی جمعرات تک جائے گی۔ پھر جیسے وہ گنگنانے لگتیں: جمعرات کی جھڑی، نہ ٹوٹے کن مِن لڑی۔

باہر کئی بارش نہ برس رہی تھی چھاجوں پانی پڑ رہا تھا۔ پانی کا جھبرا، ہاں جب پانی زور کا پڑتا تو اماں یہی کہتی تھیں۔ ساون کی بارشوں میں یہ جھبرا پڑتے ہوئے آگے نکل جایا کرتا تھا مگر اب جو برس رہا تھا تو یہ ایسا جھبرا تھا کہ مسلسل پڑ رہا تھا اور یہیں ٹھہرا ہوا تھا۔

جمعرات کی جھڑی۔۔۔ میں نے سوچا اور آج کے دن کا حساب لگایا۔ آج بھی تو جمعرات کا دن تھا۔ تاہم تسلی نہ ہوئی تو سیل فون اُٹھالیا اور اس پر تاریخ اور دن دیکھا۔ وہاں اپریل کی سترہ اور دن جمعہ تھا۔

جمعہ؟۔۔۔

مجھے کچھ اور یاد آ گیا تھا۔ میں نے جھٹ پہلو میں پڑی کتاب اُٹھالی۔ ہاں اسی کتاب میں کہیں جمعے کے دن کی بات ہوئی تھی۔ وہ بات کیا تھی؟ ذہن پر زور دیا مگر یاد نہیں آرہا تھا۔ میں نے اُسے اندازاً وہاں سے کھولا جہاں تک اپنی دانست میں رات پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ یہ اس ناول کے آخری صفحات تھے اور شاید وہاں ناول کا ایک کردار اپنے مہمانوں کو درختوں کے سائے میں بچھے موڑھوں پر بٹھا کر نپے تلے قدموں سے چلتا اپنی جھونپڑی تک گیا تھا۔ اُسے خدشہ تھا کہ اگر وہ تیز چلا تو درختوں سے جھولتے شہد کے چھتوں سے مکھیاں بدک کر اُڑیں گی اور بھن بھن کرتی مہمانوں پر ٹوٹ پڑیں گی۔

رات پڑھتے ہوئے نہیں، اب جب کہ میں جمعے والی بات کی کرید میں تھا اور شہد کی وہ مکھیاں یاد آ گئی تھیں جو چھتے سے ایک دھار میں بہتے شہد کے ساتھ ہمارے منھ تک آجاتیں یا چھڑی چھلی پر پڑتے ہی ہمارا پیچھا کر کے کاٹ لیا کرتی تھیں۔

یہ مختیارے کی طرف دھیان کے جانے کا آغاز تھا۔ پھر وہ ٹکڑوں میں یاد آتا گیا۔ یہیں میرا دھیان ناول کے اُن جملوں کی طرف گیا تھا جن میں کوئی اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ 'وہ یہ جانے بغیر اور جان لینے کا کوئی امکان دیکھے بغیر جیتا رہا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ اور اس دنیا میں وہ کس لیے زندہ ہے؟' جہاں بک مارک تھا وہاں ایسی سطریں نہیں تھیں۔ بک مارک کہیں پیچھے ہی رکھا رہ گیا تھا اور جہاں تک میں نے پڑھا تھا وہ مقام آگے تھا۔ میں نے کچھ اور یاد کرنا چاہا تو اس کے آس پاس کی ایک دو اور سطریں ذہن میں روشن ہوئیں، ایک تو وہی تھی جس میں اس سوچنے والے شخص پر ذہنی دباؤ کا ذکر آیا تھا اور دوسری میں غالباً اس نے خودکشی کا سوچا تھا۔

کئی سالوں کے بعد، جب میں پڑھ پڑھا کر ایک ٹھیک ٹھاک جاب میں تھا اور سماج میں ایک باعزت مقام پالیا تھا، مجھے کسی نے مختیارے کی خودکشی کا بتایا تھا۔ مجھے دُکھ ہوا تھا۔ بس اتنی دیر جتنی دیر ایک بھول چکے شخص کا دُکھ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے کئی صفحات الٹ پلٹ کر دیکھے اب ناول میں خودکشی والی سطریں کہیں نہیں تھیں اس سے پہلے کہ میں کتاب بند کرتا پہلے باب کی پہلی

سطر میرے دھیان میں آئی اور وہ میں نے صفحہ نکال کر دیکھ بھی کر لی۔ ٹالسٹائی کے قلم سے ٹپکی ہوئی سطر، وہاں جہاں سے جمعے کے روز پیش آنے والے واقعات سے ناول کا آغاز ہوتا تھا، وہ سطر وہیں تھی:

"سارے سکھی گھر ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن دکھی گھرانوں کا دکھ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ بالکل الگ۔"

اچانک جیسے باہر بجلی کڑکی تھی اور اندر سب کچھ روشن ہو گیا تھا۔

بارش برس رہی تھی۔ ہم دونوں بھیگے ہوئے وہاں تھے۔ چاچا دیما اور چاچی گاہراں رو رو کر آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور وہ آنسو تھے یا شاید بارش کا جھبڑا جوان کے گالوں پر پڑتا تھا۔ تب میرا دل بھر آیا تھا اور چاچی کی قمیض کا پلو کھینچ کر کہا تھا:

"چاچی آپ اتنا روتی کیوں ہیں؟"

"اپنے دکھوں کو پتر، اپنے دکھوں کو۔"

چاچی نے یہ بے اختیار کہا تھا اور پھر میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ قدرے زیادہ دیر تک دیکھتی رہی پھر آہستہ سے کہا، جیسے سسکاری بھر رہی ہو، یا جیسے سرگوشی کر رہی ہو:

"تم نہیں سمجھو گے ہم دُکھیاروں کے دُکھ۔ سمجھ ہی نہیں سکتے تم۔ پتر سارے سکھی گھر ایک سے ہوتے ہیں لیکن دُکھی گھرانوں کا دُکھ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ بالکل الگ۔"

یہ ٹالسٹائی کا جملہ تھا اور مختیارے کی ماں کا بھی جو یقیناً نہیں جانتی ہو گی کہ ٹالسٹائی کون تھا۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، عین اُن دنوں میں کہ جب گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔

میں سوچ رہا تھا رات جب بارش برسنا شروع ہوئی تھی تو جمعرات کا دِن تھا یا جمعے کا دن پڑ گیا تھا۔

کورونا اور قرنطینہ

ابھی ایک پیغام پڑھ ہی رہا تھا کہ ایک اور نوٹیفکیشن سیل کے ڈسپلے کے اوپر والے حصے میں نمودار ہوا۔ نیا نوٹیفکشن پہلے پیغام کی طرح کووڈ ۱۹ کے بارے میں کوئی حکومتی اعلان نہ تھا، یہ ساتھ والے سیکٹر سے میرے ایک دوست کا واٹس ایپ تھا جس میں ایک وڈیو کلپ بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ میں نے پہلا ایس ایم ایس بیچ میں چھوڑا اور واٹس ایپ کھول لیا۔ وہاں ایک لاش تھی؛ کورونا وائرس سے مرنے والے کی لاش۔ کچھ دیر پہلے تک جس خوف کی سرسراہٹ میں اپنے اَغل بغل محسوس کر رہا تھا وہ اب میری چھاتی پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کئی سیکٹروں میں بٹا ہوا شہر ہے۔ پوری منصوبہ بندی سے بسایا گیا خوب صورت شہر۔ پچھلے کچھ برسوں میں کشمیر ہائی وے پر جو دو سیکٹر نئے کھلے اور تیزی سے آباد ہوئے ہیں اُن میں ایک تو ہمارا سیکٹر ہے اور دوسرا اِسی سے متصل وہ سیکٹر جہاں سے میرے دوست نے واٹس ایپ میں یہ لاش والا کلپ بھیجا تھا۔ گویا یہ وبا، جو شہر کے دوسری طرف بارہ کہو کے کئی گھروں میں گھس چکی تھی، اب ہمارے پہلو تک آ پہنچی تھی۔ وڈیو کھلتے ہی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی تھی جو ایک خوب صورت بیڈ پر سفید چادر اوڑھے چت پڑا تھا۔ یہ چادر جس طرح سر سے پاؤں تک تنی ہوئی تھی، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اُس نے خود اپنے اوپر نہ تانی تھی کسی اور نے اوڑھائی تھی۔ جو اُس نے خود اوڑھ رکھا ہوگا وہ گہرے بھورے رنگ اور سرخ پھولوں والا کمبل تھا جو لاش کے پہلو میں گچھی مچھی پڑا تھا۔ اُس لاش ہو چکے شخص کے علاوہ وہاں موجود دو میں سے ایک شخص نے ابھی پوری طرح اُسے لاش نہ مانا تھا۔ وڈیو میں سب سے پہلے اُسی دوسرے شخص کی کپکپی میں لتھڑی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ وہ تیسرے شخص سے کہہ رہا تھا:

”دیکھ لیں ذرا ایک بار پھر۔“

اس دوسرے شخص کی لرزتی آواز کے ساتھ تصویر کے لرزنے سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ہو نہ ہو وڈیو بھی وہی بنا رہا ہوگا۔ تیسرے شخص کا ردعمل بالکل کاروباری تھا۔ یوں، جیسے کسی شخص

کا نڈھال پڑا ہونا یا اس کا لاش ہو جانا، دونوں میں کچھ نیا نہ تھا۔ بے خوف شخص پوری طرح چوکس تھا۔وہ مکمل تیاری کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر ماسک اور آنکھوں پر بڑے بڑے شیشوں والی عینک تھی جب کہ اُس نے سر سے پاؤں تک ایسی ڈانگری چڑھا رکھی تھی کہ اُس کا پورا بدن اس میں چھپ گیا تھا۔ ڈانگری ویسی ہی سفید تھی جیسی لاش پر پڑی چادر تاہم دائیں بائیں کی نیلے کپڑے کی جیبوں پر سرخ رنگ کے ''ایدھی'' کے لفظوں سے اس کی سفیدی بھی مدہم پڑ گئی تھی۔ اس چوکس شخص کے دائیں ہاتھ میں پیلے رنگ کی پلاسٹک کی بوتل تھی۔ اُس میں بھرا ہوا محلول یہاں وہاں مسلسل چھڑکتے ہوئے وہ سپاٹ لہجے میں دوسرے شخص کے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔

''نہیں صاحب یہ ڈیڈ ہے۔ میں نے دیکھا ہے اس کے منہ سے بلبلی نکلی ہوئی ہے۔''

''بلبلی؟''

دوسرے شخص نے لرزتی آواز میں بس اتنا کہا۔

''ہاں بلبلی، میرا مطلب ہے جھاگ؟''

اس سوال جواب کے دوران دوسرے آدمی کا ہاتھ اس زور سے کانپا تھا کہ تیسرا شخص فریم سے نکل گیا۔ اب فریم میں بیڈ کے پاس ہی پڑا ہوا اسٹریچر نظر آ رہا تھا جو یقیناً ایدھی والا شخص ایک مریض ہسپتال لے جانے کے لیے لایا ہوگا۔ اس پر ڈال کر ایمبولنس میں رکھنے اور ہسپتال میں لے جانے کے لیے۔ باہر گلی میں کھڑی ایمبولنس کی مخصوص آواز بھی ویڈیو میں سنائی دے رہی تھی، جو ایک ممکنہ مریض لے جانے کے لیے وہاں دوسرے شخص نے فون کر کے منگوائی ہو گی مگر وہاں کوئی مریض نہ تھا، محض ایک لاش پڑی تھی۔

تیسرے شخص نے آخری بار اپنے اسٹریچر پر دوا چھڑکی اور ویڈیو میں نہ نظر آنے والے شخص سے کہا:

''یہ ڈیتھ کورونا وائرس سے ہوئی ہے''

''کُکو وکوروونا وائرس سے''

دوسرے شخص کی کپکپاتی آواز یوں آئی، جیسے ایک ایک لفظ نوک دار تھا اور اس کے حلقوم سے پھنس پھنس کر نکل رہا تھا۔ ایک دفعہ پھر پہلے شخص کی لاش اور پیلی بوتل سمیت تیسرا شخص فریم میں تھا۔

''آپ خود چیک کر لیں، یہ ڈیڈ ہے۔''

''ڈاااکٹر کو دکھالیں؟''

''نہیں، ڈاکٹر نہیں، پولیس''

''پول ی ی ی یس''

اب لاش اور تیسرا شخص فریم میں نہیں تھے۔ تاہم اس دو ہاتھ اسٹریچر کی طرف بڑھتے دکھائی دے رہے تھے جو انجانے میں فوکس ہو گئے تھے۔ اسے اپنے تئیں یقین ہو چکا تھا کہ وہاں اس کے کرنے کا کوئی کام نہیں تھا۔ اسٹریچر خالی تھا اور وہ اسے خالی لے جانے کے لیے وہ پوری طرح تیار تھا۔

''جی، پولیس کو۔۔۔ون فائیو کو۔۔۔رپورٹ کریں۔ اجازت لیں۔۔ کرونا وائرس کی وجہ سے ڈیتھ کا کیس ہے۔''

بس، اتنا سا کلپ تھا، جسے میں نے اپنے لکھنے والی میز پر بیٹھے بیٹھے دیکھا تھا اور بہت دیر سہا وہاں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔ میری چھاتی پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ڈسپلے کے خاموش ہونے سے میرا سیل ایک ننھے تابوت جیسا دکھائی دینے لگا تھا۔ میرے بیٹھے بیٹھے اس منے سے تابوت سے قد آدم لاش نکلی اور میری آنکھوں کے سامنے فضا میں جھولنے لگی تھی۔ ایسی لاش جس کے ہونٹوں پر جمی ہوئی زردی مائل کف تھی اور جس سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے؛ اتنے کہ، اس تعفن کے باعث میری سانسوں میں رخنے پڑنے لگے اور جی متلانے لگا تھا۔

میں وہاں مزید نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اُٹھا، اپنی چھاتی کو زور سے دبا کر سانسوں کو معمول پر لانا چاہا اور لاؤنج میں آکر صوفے پر ڈھے گیا۔ میں نے اپنے بیڈروم کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا، بالکل ویسے ہی جیسے میں بند کر کے اسٹڈی میں گیا تھا؛ گویا ابھی بیگم سو رہی تھی۔ بچے جاگنے پر، سیڑھیوں سے دھپ دھپ کرتے سیدھے لاؤنج میں آتے تھے، وہ بھی ابھی تک نہیں جاگے ہوں کہ سیڑھیاں خاموش تھیں۔ صرف سیڑھیاں ہی نہیں پورا گھر خاموش تھا، بس ایک سناٹا تھا جو سارے میں گونج رہا تھا۔

میری بے چینی کسی طور کم ہونے میں نہ آرہی تھی۔ چھاتی کا بوجھ بڑھتا گیا تو میں اُٹھا اور صدر دروازہ کھول کر باہر سے آنے والی یخ ہوا کے لمبے لمبے گھونٹ بھرنے لگا۔ ہلکا سا اچھو لگنے کے باوجود یوں سانس لینا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے پورچ میں کھڑی کار کو دیکھا، جو لاک ڈاؤن کے سرکاری اعلان کے بعد وہیں کھڑی تھی۔ میں بڑبڑایا'' اس کی تو

بیٹری بیٹھ گئی ہو گی۔'' ہر طرف اتنی خاموشی تھی کہ میں اپنی بڑبڑاہٹ سے چونک کر کار، اور اس سے پرے بند پڑے آہنی گیٹ کے اُوپر سے خاموش سڑک کو وہاں تک دیکھتا چلا گیا جہاں تک نظر آ سکتی تھی۔ جب یخ ہوا کا قدرے تیکھا جھونکا آیا، کچھ میری چھاتی سے ٹکرایا کچھ ناکوں میں گھسا اور باقی چہرے سے رگڑ کھاتا اندر بڑھ گیا تھا تو شاید میں نے تھوڑی سی یخ ہوا ناک میں اُچک لی تھی۔ ناک میں خراش پیدا ہوئی اور بے اختیار زور کی چھینک نکل گئی۔ دوسری چھینک کو میں جبر کر کے ٹالتا رہا مگر وہ نہ ٹلی اور میری آنکھوں سے ضبط کے آنسو پھوٹ بہے تھے۔

میں نے پیچھے ہٹ کر دروازے کے پٹ بھیڑ دیے مگر یخ ہوا نے جو کام کرنا تھا کر دیا تھا۔ میں مسلسل چھینکنے پر مجبور تھا، چھینک روکتا تو آنکھوں کے ساتھ ساتھ ناک سے بھی پانی بہہ نکلتا۔ ٹشو پیپر کا ڈبہ تلاش کرنے تک کھانسی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ کھانسی خشک تھی اور حلقوم کو چھیدتی ہوئی باہر نکلتی تھی۔ کورونا کے مریضوں کی جو علامات اب تک مشتہر کی گئی تھیں ان میں ایک خشک کھانسی بھی تھی؛ بس یہ یاد آنا تھا کہ کھانستے کھانستے چھاتی زور سے دبا لی۔ تو کیا مجھے بھی اس موذی وبا نے آ لیا تھا؟ ابھی کل ہی مجھے لاہور سے تبسم کاشمیری نے ایک ویڈیو کلپ بھیجا تھا۔ سن 1918ء میں سپینش فلو نامی وبا سے زندہ بچ نکلنے والے ولیم سار دو جے آر، کے انٹرویو کا کلپ۔ یہ انٹرویو کچھ سال پہلے، کہ جب وہ چورانوے سال کا تھا، تب ریکارڈ کیا گیا تھا۔ انٹرویو دیکھتے ہوئے میں نے نوٹ کیا تھا اس کا چہرہ اور ہاتھ جھریوں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ صوفے میں کمر دوہری کیے ایک خوفزدہ بچے کی طرح دھنسا بیٹھا تھا۔ اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے وہ اپنی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے آنکھوں کو پوری طرح کھول کر دیکھ رہا تھا اور اُس کے ہونٹوں سے لفظ یوں ترتیب وار نکل رہے تھے جیسے سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا تھا۔ بوڑھے ولیم نے بتایا تھا کہ سپینش فلو سے دنیا کی ایک تہائی آبادی شدید متاثر ہوئی تھی اور پانچ کروڑ لوگوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔ یہ فلو کنساس میں ایک فوجی کو ہوا، اور پھر وبا بن کر پھیلتا چلتا گیا تھا۔ وبا کا حملہ بہت اچانک اور شدید ہوتا تھا۔ ایک صبح اگر چھ بجے کوئی اپنی ماں کے فلو سے مرنے کی اطلاع دیتا تو شام پڑنے سے پہلے پہلے تک اس کا پورا کنبہ جا چکا ہوتا۔ بوڑھے ولیم کے گھر کے آٹھ افراد میں بس وہی اکیلا بچ پایا تھا۔

ولیم کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھ پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اس دورے میں وقفہ آیا تو میں بار بار اپنی نبض ٹٹول رہا تھا کہ کہیں مجھے بخار تو نہیں تھا۔ کورونا کے حوالے سے جو علامات

بنائی جا رہی تھیں، شاید اُن میں بخار کی شدت بعد میں بڑھتی تھی، پہلے یہ وائرس ناک منہ اور آنکھوں میں گھستا اور وہاں ٹکر مار کر پڑ رہتا پھر سانس کی نالی سے اندر کھسکتا پھیپھڑوں میں پہنچ کر جاتا تھا۔ یوں بیماری کی علامات کے ظاہر ہونے میں پانچ چھے روز لگ جاتے تھے۔ اگرچہ گلے کی خراش، ہلکی پھلکی کھانسی، نزلہ اور چھینکیں کورونا کی حتمی علامات نہ تھیں مگر اس امکان کو رد بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے تھرما میٹر تلاش کیا اور اپنی زبان کے نیچے دبا کر اور سانس روک کر بیٹھ گیا۔ یوں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا اور زور کی چھینک آئی تو تھرما میٹر ہونٹوں سے پھسل کر باہر اُچھلا اور فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ جب میں کانچ کے ٹکڑے فرش سے چننے کے لیے جھکا ہوا تھا تو بیڈ روم کا دروازہ چرچرایا۔ میں چونک کر مڑا اور وہاں بیگم کو دیکھا جو میری طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے بوڑھے ولیم کی باتیں یاد آ گئیں تو اُسے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روکنا چاہا، مگر چھینک اور کھانسی ایک ساتھ آئیں اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیا۔ بیگم نے مجھے تسلی دینا چاہی تھی کہ مجھے کوئی کورونا ورونا نہیں تھا اور یہ بھی کہ رات کے مختصر لباس میں باہر نکلنے سے مجھے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ مجھے قدرے تسلی ہو رہی تھی مگر اندر کہیں خوف بیٹھا ہوا تھا لہٰذا مُصر ہوا کہ گھر کے سب افراد مجھ سے خود کو الگ رکھیں۔ اسی اثنا میں سیڑھیوں پر بچوں کے قدم پڑنے کی آواز آئی۔ میں تیزی اُٹھا، اپنے کمرے میں گھسا اور دروازہ بند کر لیا۔ بیگم، جو کچھ دیر پہلے میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی شاید اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اور بچے باہر لاؤنج میں تھے اور چپ تھے۔ میں اندر دروازے سے پشت ٹکائے دیر تک کھڑا رہا۔ لاؤنج میں جب تک بچے رہتے تھے وہاں ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔ میں نے اپنی سماعت باہر کی سمت لگا رکھی تھی مگر وہاں اتنی خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی سانس بھی نہ لے رہا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ کر بستر پر دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لی تھیں۔

بیگم اور بچوں کی پریشانی باہر سے رس رس کر اندر آ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے زیادہ اُن کی فکر کھائے جاتی تھی۔ اس وائرس کی روک تھام کا ایک حیلہ سماجی فاصلہ تجویز ہوا تھا۔ احتیاط لازم تھی اور مجھے تو چھینکیں اور کھانسی بھی آئی تھی اور شاید بخار بھی ہونے والا تھا۔ مناسب یہی تھا کہ میں خود کو سب سے الگ تھلگ کر لوں، جو ہونا ہے وہ مجھ میں ظاہر ہو، میرے پیاروں میں نہیں۔ یوں ہی پڑے پڑے جب خوف پر اکتاہٹ نے غلبہ پا لیا تو میں نے فیصلہ کیا، گومگو سے نکلنے کے لیے مجھے اپنا کورونا ٹسٹ کروا لینا چاہیے۔ اس طرح بچے بھی اس اذیت سے نکل سکتے تھے جو میری وجہ سے اُنھیں اُٹھانا پڑ رہی تھی۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے سیل فون سے ایک ایک کر کے کئی نمبر ملائے

مگر ہر کہیں سے ناکامی ہوئی۔ شہر میں کورونا ٹسٹ کی محدود سہولت تو تھی، مگر مجھے بتایا گیا تھا کہ ٹورنٹو ائر پورٹ پر پھنسے ہوئے تین سو مسافر اسلام آباد ائیر پورٹ سے ہوٹل لے جائے گئے جہاں اُن کے ٹسٹ ہو رہے تھے۔ ہسپتال سے مجھے یہ نصیحت کی گئی کہ میں گھر پر ہی ٹھہروں اور کسی پریشانی کی صورت میں اُن سے رابطے میں رہوں تاکہ اگر مجھے قرنطینہ کی ضرورت پڑے تو ایمبولینس بھجوائی جاسکے۔

سرکاری سطح پر ہسپتالوں میں قائم قرنطینہ کے بارے میں کچھ اچھی خبریں نہ آرہی تھیں۔ قرنطینہ اور وہ بھی چودہ دن کا؛ یہ سنتا تھا کہ مجھے بیدی کا ایک افسانہ یاد آ گیا تھا۔ وہی، جس میں بیدی نے لکھا تھا کہ شہر میں طاعون سے اتنی اموات نہ ہوئی تھیں جتنی سرکاری قرنطینہ میں ہوئی تھیں۔ خبروں کے مطابق وبا کے اِن دنوں میں ہسپتالوں پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ وہاں ڈاکٹروں اور نرسوں کی مدد حاصل کی جاسکتی تھی، مگر یہ مدد کس کس کو اور کس حد تک مل پائے گی یقین سے کچھ نہ کہا جاسکتا تھا کہ ڈاکٹر اور نرسیں ابھی تک اپنے لیے حفاظتی سامان سے محروم تھے۔ مجھے رہ رہ کر بوڑھے ولیم کی باتیں یاد آرہی تھیں اور بیدی کے افسانے کے ولیم کی بھی۔ یہ کیسا اتفاق تھا کہ بیدی کے افسانے میں بھی ایک ولیم تھا۔ ولیم بھاگو، جو شہر میں وبا سے مرنے والوں کی لاشیں اُٹھاتا اور قرنطینہ میں بھی ڈیوٹی دیتا تھا۔ اُن دنوں، جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا، وہ ایک ایک مریض کی مدد کر رہا تھا۔ لیکن سانحہ یہ ہوا کہ اِس ولیم کے گھر کا دروازہ بھی وبا نے دیکھ لیا تھا۔ اس کی بیوی کے گلے اور بغلوں میں گلٹیاں نکل آئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیوی کو قرنطینہ لے جائے کہ وہاں شہر میں مرنے والوں سے زیادہ مر رہے تھے اور بہ قول اُس کے وہ دوزخ تھا دوزخ۔

لاحول ولاقوۃ۔ میں نے سر جھٹکا اور بیدی کے افسانے کو اپنے ذہن سے نکالنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو مطمئن کیا کہ ابھی تک صورت حال اتنی دِگرگوں نہ ہوئی تھی۔

جب کمرے کے دروازے پر بیگم نے بہت آہستگی سے دستک دی تب تک میں سر جھٹک کر قدرے سنبھل چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھوں پر دستانے چڑھائے، ناک منہ پر ماسک لیا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر قدرے دور کھڑے کھڑے کہا: ”جی۔“ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ میں نے جھانک کر اُسے کو دیکھا، اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے کناروں تک بھری ہوئی تھیں اور دوپٹے کا پلو دانتوں تلے دبا ہوا تھا۔ کچھ کہے بغیر، اُس نے تھرمس اندر مجھے تھما دیا۔ تھرمس میں گرم پانی تھا۔ نہیں محض گرم پانی نہیں کہ اس میں شاید دار چینی، الائچی، سبز چائے کی پتیاں یا کچھ اور ڈال

کر اُبال لیا گیا تھا کہ اس کا رنگ بدلا ہوا تھا اور ذائقہ بھی۔ میں جرعہ جرعہ خوش ذائقہ گرم پانی حلقوم میں اُتارتا رہا۔ بتایا جا رہا تھا کہ اِن دِنوں گرم پانی پینا مفید تھا۔ یہ کتنا مفید تھا میں نہ جانتا تھا مگر وقفے وقفے سے پینے لگا تو میرے اندر کی بے چینی بھی پگھل پگھل کر نیچے جانے لگی تھی۔ اس کے بعد تو گویا سپلائی لائن بحال ہو گئی تھی۔ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کے لیے اندر آ رہا تھا۔ دروازہ کھلتا تو ہر بار بچوں کی سہمی سہمی آوازیں بھی اندر سرک آتی تھیں۔ یقیناً وہ وہاں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے ہوں گے۔ سہ پہر پڑنے سے پہلے پہلے میں اپنے اُسی دوست کا ایک اور میسج پڑھ چکا تھا جس نے صبح لاش والی ویڈیو بھیجی تھی۔ اس میں سرکاری سطح پر وضاحت فارورڈ کی گئی تھی کہ مرنے والے کی موت کا سبب کرونا وائرس نہیں ڈرگز تھیں۔ کوئی کورونا سے مرتا یا ڈرگز سے بات تو دُکھ والی تھی تاہم اچانک مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے ذہن سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا تھا۔ اب میں ڈھنگ سے ساری صورت حال پر پھر سے غور کر سکتا تھا۔ میں نے ترتیب وار ایک ایک واقعے کی بابت سوچا اور ہر واقعے کا تجزیہ کیا تو مجھ پر کھلا کہ کمرے میں گھسنے کے بعد نہ تو میں کھانسا تھا اور نہ ہی مجھے کوئی چھینک آئی تھی۔ بس یہ سوچنا تھا کہ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر بچوں کی سمت لپکا۔ مجھے اپنی سمت یوں بڑھتے پا کر بچے بوکھلائے اور صوفوں میں کچھ اور دُبک گئے۔ میں ابھی اس نئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ بیگم بجلی کے کوندے کی تیزی سے کچن سے نکلی اور بچوں اور میرے درمیان تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ناصر عباس نیر

مرگِ عام نعمت ہے

اس خصوصی اجلاس کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش صرف اس لیے نہیں تھی کہ وہ اس دیوان خانے میں ہونے والی گفتگو کو اہم سمجھتے تھے، اتنا اہم کہ ان کا پختہ یقین تھا کہ اجلاس میں شریک چند لوگ ہی اسے سمجھ سکتے اور اپنے تک محدود رکھ سکتے ہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ اس کوشش کے ذریعے اس اجلاس کا سربراہ جو شہزادہ ہے اور ولی عہد ہے، ایک بار پھر یقین کر لینا چاہتا تھا کہ اسے سب پر کس قدر اختیار حاصل ہے۔ وہ خود محسوس کرتا تھا کہ اسے بار بار اس یقین کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب اچانک حالات نے جو پلٹا کھایا تھا اس سے وہ پریشان بھی تھا اور کچھ کچھ پرامید بھی۔ اپنی پریشانی سے نکلنے کا پہلا طریقہ اسے یہ نظر آیا کہ وہ ایک بار پھر یقین کر لے کہ اسے سب پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ اس نے اجلاس کے لیے نہ تو کسی سرکاری عمارت کا انتخاب کیا، دربار کے کسی مخصوص حصے کا اور نہ اپنی اقامت گاہ کا۔ وہ پورا ایک دن اجلاس کی جگہ کے متعلق غور کرتا رہا۔ پہلے تو وہ ان سب اہم عمارتوں کے بارے میں سوچتا رہا جو اس شہر میں موجود ہیں اور جن پر سرکار کو کلی اختیار حاصل ہے۔ اپنے بعض وزیروں مشیروں کی اقامت گاہوں کے بارے میں بھی سوچا، مگر وہ سب اسے غیر محفوظ محسوس ہوئیں۔ یہ سب سوچتے ہوئے، اسے ایک انوکھا خیال سوجھا۔ کیوں نہ وہ اپنا دشمن بن کر سوچے؟ دشمن اس کا کہاں کہاں اور کیسے کیسے پیچھا کر سکتا ہے؟ کافی دیر کے غور و تامل کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے دل میں جس قدر دشمن کا ڈر ہے، اس قدر وہ اس کو پہچانتا نہیں ہے۔ اسے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ دشمن کسی ایسی خفیہ جگہ چھپا رہتا ہے جس تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس کا دشمن اسی وقت، جانے کہاں سے برآمد ہوتا اور اس کا تعاقب کرتا ہے جب وہ کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ یہ جان کر اس کی پریشانی بڑھ گئی کہ وہ اتنا اہم اجلاس کہیں بھی منعقد کر لے، دشمن کی زد سے وہ باہر نہیں ہو سکتا۔ وہ جب رات کے کھانے کے بعد قہوہ پی رہا تھا اور اس نے تخلیے کا حکم دیا تھا تو اسے یہ خیال سوجھا کہ دشمن کی خفیہ جگہ کون سی ہو سکتی ہے؟ کیوں نہ وہ اسی جگہ یہ اجلاس رکھے! یہ خیال انوکھا تھا اور اسے آسودگی کا ایک لمحہ بھی دے گیا، لیکن یہ سمجھنا

نہیں تھا کہ وہ جگہ کون سی ہو سکتی ہے؟ اب اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ وہ کن لوگوں کا دشمن ہے اور کیسے ان کا پیچھا کرتا ہے۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ جن لوگوں سے کوئی بھی خطرہ محسوس کرتا ہے، سب کو دشمن کے زمرے میں رکھتا ہے۔ ان کی تعداد و شمار کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ اپنی چوتھی بیوی کی جاسوسی بھی کراتا ہے اور جو اس کی جاسوسی پر مامور ہے، اس کی جاسوسی بھی کی جاتی ہے۔ وہ اپنے نوجوان بیٹوں کی جاسوسی بھی کراتا ہے کہ کہیں کسی دشمن کے ورغلانے میں نہ آجائیں۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر دشمن کا خفیہ ٹھکانا اس کی سب سے زیادہ اور شاید واحد ذاتی چیز ہوتا ہے۔ وہ اطمینان سے سویا کہ اس نے یہ خاص الخاص اجلاس منعقد کرنے کی جگہ کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وہ کل آٹھ تھے۔ وہ سب سے آخر میں نکلا۔ اس نے دیوان خانے کا جائزہ لیا۔ کوئی خصوصی نشستیں نہیں لگائی گئی تھیں۔ سب اس قالین پر بیٹھے جسے صرف ایک دن پہلے خریدا گیا تھا اور اجلاس سے کچھ دیر پہلے یہاں لایا گیا تھا۔ بس جہاں شہزادہ بیٹھا تھا، اس جگہ شاہی مسند بچھائی گئی تھی۔ اجلاس ختم ہوتے ہی قالین اور مسند کو راکھ کردینے کا شاہی حکم جاری ہوا۔ کسی کو کھانے پینے کے لیے کچھ پیش نہیں کیا گیا۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ کوئی شے اس کے اختیار سے باہر نہیں تھی۔

دیوان خانے میں دبی دبی ہنسی ابھر ڈوب رہی تھی۔

اتنے طاقت ور ہوکر بھی ایک دوسرے سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ یہ آواز اس پورٹریٹ سے آئی جو اس دیوان خانے میں کافی عرصے سے آویزاں تھا۔

آدمی کو جس مٹی سے بنایا گیا تھا وہ چوری کی گئی تھی، اس لیے۔ رقاصہ کی تصویر نے جواب دیا جسے ایک جلاوطن مصور نے بنایا تھا۔

اب بات سمجھ میں آئی۔ چوری کرتے ہوئے، مٹی کی خاصیت پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس سیاہ رنگ جوان کی تصویر نے قہقہہ لگایا جسے عین جوانی میں مار ڈالا گیا تھا۔

آدمی کو بنانے میں دیوتا جلدی میں تھے۔ پورٹریٹ نے نکتہ آفرینی کی۔

وہ جلدی آدمی میں بھی سرایت کرگئی ہے۔ رقاصہ بولی۔ ابھی تم نے دیکھا نہیں کہ کیسے وہ آٹھ کے آٹھ جلدی میں تھے۔ آنے کی بھی جلدی تھی۔ ایک دوسرے سے پہلے بات کرنے کی جلدی تھی۔ جاتے ہوئے ہر شخص پہلے نکلنا چاہتا تھا جیسے یہ عمارت ابھی زلزلے سے گر پڑے گی۔

ڈر اور عجلت، یہ ہے آدمی۔ سیاہ رنگ جوان بولا۔

ایک اور چیز بھی ہے، جس کے بغیر آدمی مکمل نہیں ہوتا: ہر واقعے کو موقع میں تبدیل کرنا۔ پورٹریٹ بولا۔

یہ تو ان کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا۔ سربراہ اجلاس نے آغاز ہی اس بات سے کیا تھا کہ "ہم اس موقع کو ضائع نہیں ہونے دیں گے"۔ رقاصہ نے تائید کی۔ ہمیں تو انھی سے معلوم ہوا کہ بے تحاشہ لوگ مر رہے ہیں۔ جیسے خزاں میں درختوں سے پتے ہوا کے سرپھرے جھونکے سے گرتے ہیں ایسے ہی آدمی خاک میں مل رہے ہیں۔

آدمیوں کا مرنا اتنا بڑا واقعہ تو نہیں اور نہ یہ پہلی بار ہو رہا ہے؟ سیاہ رنگ جوان بولا۔

تم نے دیکھا نہیں کہ ان آٹھوں میں صرف ایک شخص آدمیوں کے مرنے سے پریشان تھا۔ باقیوں کے لیے وہ ایک ایسا مسئلہ لگ رہا تھا جیسے وہ راہ عام میں پڑے اولے ہوں۔ پورٹریٹ نے رائے دی۔

وہ کون تھا؟ رقاصہ نے پوچھا۔

وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ وہ مسلسل کچھ پڑھے جا رہا تھا۔ پورٹریٹ نے جواب دیا۔

ہاں یاد آیا۔ اس نے کہا تھا کہ مرگ عام اس سکول ماسٹر کی طرح ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ تختی کے بغیر بچے سبق نہیں سیکھتے۔ لیکن اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ مرگ عام کا سبق یہ ہے کہ زمین پر ہماری حیثیت ایک ریشمی لباس کی سلوٹ سے زیادہ نہیں۔ رقاصہ بولی۔

ابھی اس شخص نے بات مکمل نہیں کی تھی کہ شہزادہ کہنے لگا، پہلے مجھے پوری بات کر لینے دو۔ پورٹریٹ کہنے لگا۔ اس نے کہا تھا کہ اس وبا میں جو لوگ بچ رہے ہیں وہ موت کے خوف کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ بات اچھی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم سب کو یہ بات عجیب لگے گی۔ اگر موت کا ڈر، جو کسی بھی خوف کی انتہا ہے، لوگوں کی عادت بن گیا تو ہم اس موقع کو کھو دیں گے۔

ہاں، وہ باتونی شخص تھا۔ اس نے لمبی بات کی تھی۔ رقاصہ کہنے لگی اور شہزادے نے جو کہا تھا، اسے دہرانے لگی۔ میں تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن تم ایک دوسرے کی طرف شک اور تجسس کی نظروں سے مت دیکھو۔ میرے لفظوں پر غور کرو۔ کوئی شک یا تجسس ہے بھی تو اسے، اس وقت تک جب تک یہ اجلاس چلتا ہے، معطل رکھو۔ اس میں ہم سب کا بھلا ہے۔ تم میں سے کچھ نے

ضرور اس وبا میں کسی عزیز کو کھویا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کسی کے خاندان میں ایک سے زیادہ لوگ مرے ہوں۔ کسی نے ماں باپ میں سے کسی کو یا دونوں کو، کسی نے بچوں میں سے کسی کو کھویا ہو۔ کسی کی بہن، چچا، ماموں، دادا، دادی کوئی بھی ---- یاد رکھو ہر وبا کا مزاج جمہوری ہوتا ہے۔ وہ فرق نہیں کرتی۔ وبا واحد چیز ہے جو ہمیں ان لوگوں کے قریب لاتی ہے، جو ہماری قربت کو ترستے ہیں۔ ہال یاد آیا--- پرویز صاحب جن کی آنکھیں نم ہو رہی ہیں، ان کے دو بڑے بھائی رخصت ہو گئے۔ ہم ان کے دکھ میں شریک ہیں۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ایک کھیل کے میدان میں ہیں۔ کسی کھلاڑی کو دم بھر کو رکنے کی اجازت ہے نہ لڑکھڑانے کی۔ کھیل سے باہر نکلنے کا مطلب اس میدان ہی سے باہر جانا ہے۔

تم تو فر فر جیسے اپنا سبق سنا رہی ہو۔ سیاہ رنگ جوان نے رقاصہ کو ٹوکا۔

ابھی آگے سنو۔ کچھ باتیں تو اس نے گویا ہمارے بارے میں بھی کہیں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہاں جو کچھ کہا اور کیا جاتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رہتا ہے اور ہم تو اس سے پہلے کی باتیں بھی جانتے ہیں مگر یہ مورکھ نہیں سمجھتے۔ رقاصہ نے بات جاری رکھی۔ شہزادے نے کہا تھا کہ اس وبا نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ ہم اس عظمت کو حاصل کر سکیں جو کسی بھی ملک کا خواب ہو سکتی ہے۔ تم لوگ اس سلطنت کے سب سے بڑے مصور کو جانتے ہو۔ اس کی ایک ایک تصویر کو خریدنے کے لیے امرا کی دولت کم پڑ جاتی ہے۔ اس کے دبستان کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن کم لوگ ہیں جو اس کی زندگی کے بارے میں جانتے ہیں۔ یہ دہراتے ہوئے رقاصہ نے آہ بھری۔

کیا تمھیں اسی مصور نے بنایا تھا؟ سیاہ رنگ جوان نے پوچھا۔

نہیں۔ رقاصہ نے مختصر جواب دیا۔

تمھارا خالق کون تھا؟ پورٹریٹ کو تجسس ہوا۔

وہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ رقاصہ نے کہا۔ لیکن مجھے لگا کہ اس نے مصور کے بارے میں جو کچھ کہا، اس کا ہم سب سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ اجلاس کے سربراہ نے کہا تھا کہ وہ مصور ایک امیر باپ کا عیاش بیٹا تھا۔ باپ کی موت کے بعد جلد ہی کنگال ہو گیا۔ اسی شہر کی گلیوں میں وہ بھیک مانگتا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے بس ایک تصویر مکمل کرتا تھا۔ اس نے کوئی تصویر دو نشستوں میں مکمل نہیں کی۔ آج وہ ایک عظیم صاحب اسلوب مصور ہے۔ کوئی اس کے اسلوب کی نقل نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے ان سب کی طرف دیکھا اور پوچھا تھا کہ کیوں؟ پھر خود ہی جواب دیا۔ اس

لیے کہ کوئی اس کی مانند دن کو بھیک مانگ کر اپنی روح کو مسلسل آزار میں نہیں رکھ سکتا۔ کوئی اس کی طرح ذلت کو خاموشی سے نہیں سہہ سکتا۔ اس نے کسی ایک فن پارے میں بھی اپنی ذاتی زندگی کو پیش نہیں کیا۔ اسی لیے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ اس کے فن کے بارے میں یہ بات سب نے سنی ہوگی کہ اس نے کوئی ایک لمحہ بھی انسانی روح کے عظیم ترین آدرشوں پر غور کیے بغیر نہیں بسر کیا۔ اس کی عظمت، اپنی حالت سے، اصلی حالت سے فرار میں نہیں تھی۔ اس نے بس یہ قبول کرلیا تھا کہ اسے یہی زندگی ملی ہے، اس نے اس کے خلاف لڑنے کی بجائے، کڑھنے کی بجائے، اپنے فن پر توجہ دی۔ تم کہو گے، اتنی بڑی وبا میں میں یہ کس کا قصہ لے کے بیٹھا ہوں۔ اس کا گہرا تعلق ہم سے، آج سے ہے، اس اجلاس سے ہے۔ ہمارے محبوب مصور نے عظمت حاصل کی، اپنی حالت کو ایک عظیم، دانش مند ہستی کا فیصلہ سمجھ کر۔ اس نے موقع ضائع نہیں کیا۔ ہم اس مرگ عام سے فرار نہیں چاہتے۔ ہم بھی اسے ایک عظیم دانش مند ہستی کی حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دن رات توبہ استغفار میں لگے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ انھیں اس وقت بھی یہی کام کرنا چاہیے جب آخری شخص آخری ہچکی لے رہا ہو۔ یہ وبا کب ختم ہو، ہم نہیں جانتے۔ ہم اس عظیم دانش مند ہستی کے ذہن کو پڑھنے سے قاصر ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس وبا کے خوف کو مرنے سے بچائے رکھیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر لوگوں نے بے خوفی سے اس وبا کو قبول کرلیا تو ----- اس کا تصور بھی محال ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں سے زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ بلکہ یہ کہ ہم ایک بڑا موقع، ایک عظیم نعمت کو کھودیں گے۔ ہم اپنے ہی لوگوں کے مجرم ہوں گے۔

تم نے حرف بہ حرف سب دہرا دیا۔ پورٹریٹ نے رقاصہ کی طرف تحسین کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پورٹریٹ نے یہ بھی کہا کہ وہ شہزادے میں اس کے باپ کو تلاش کررہا تھا۔ وہ بھی اسی طرح ذہانت کی باتیں کرتا تھا۔

میرا کوئی کمال نہیں۔ وہ سب حرف بہ حرف محفوظ ہے۔ رقاصہ نے کہا۔

لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ان سب میں سے کسی ایک کی نگاہ بھی ہماری طرف نہیں اٹھی؟ سیاہ رنگ جوان بولا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

ہماری طرف دو لوگوں نے دیکھا تھا جب وہ سربراہ اجلاس کی باتوں سے بے زار ہوئے تھے۔ شہزادے نے ایک سے زیادہ مرتبہ مجھے دیکھا تھا۔ لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری تقدیر ابدیت ہے جو دراصل کبھی ختم نہ ہونے والی قید تنہائی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں یہ سزا ان

لوگوں نے دی ہے جو خود اپنی موت سے خوفزدہ تھے۔ رقاصہ بولی۔ لیکن شکر کرو کہ ہم ان مرضوں سے بچے ہوئے جو ہمارے بنانے والوں کو لاحق تھے۔ وہ سب اپنے گزرے دنوں اور اپنے کیے دنوں پر رویا کرتے تھے۔ رقاصہ نے مزید کہا۔

جس وقت شہزادہ عظیم نعمت کی بات کر رہا تھا۔ ایک شخص کسمسا رہا تھا۔ وہ شخص اس کے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی پریشانی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ٹھیک میرے سامنے بیٹھا۔ سیاہ رنگ جوان بولا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کہنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ پورٹریٹ کہنے لگا۔ اس نے کھول کر بتا دیا تھا کہ وہ کیوں دیا کے ڈر کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں :جس وقت ہر شخص کو اپنی یا اپنے پیاروں کی موت کا دھڑکا لگا ہو، اس وقت اس کی فطرت میں چھپا لالچ پوری بے شرمی کے ساتھ باہر آجاتا ہے۔ یہ خبریں تم سب نے پڑھی ہوں گی۔ جو دکانیں بھائیں بھائیں کرتی تھیں، وہاں لوگ مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ دکانداروں کو پیسوں کا حساب کرنے میں وقت ہو رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سامان خریدنے پر ہاتھاپائی معمول بن گئی۔ ہر شے کے دام اس کی لاگت سے سیکڑوں گنا بڑھ گئے۔ ہر کوئی لوٹ رہا تھا اور لٹ بھی رہا تھا۔ شہر کے چھاپہ خانوں میں دعاؤں اور ردّبلا الواح پر مبنی اوراق دھڑا دھڑ شایع ہونے لگے۔ پیروں فقیروں کے ٹھکانوں پر بھیڑ بڑھ گئی۔ لوگ گھروں کی چیزیں بیچ کر مہنگی دوائیں خریدنے لگے۔ ہر شے زیادہ سے زیادہ ذخیرہ کرنے اور ہڑپ کر لینے کی ہوس انتہا کو پہنچ گئی۔ تم کہو گے کہ اس وبا نے ان کی فطرت کے تضاد کو کھول دیا۔ نہیں، اس میں کوئی تضاد نہیں کہ لوگ چیزیں بھی جمع کریں اور خدا کے آگے بھی جھکیں۔ وبا میں سہمے ہوئے آدمی کا جسم، ذہن، روح اور تخیل بھی لالچی ہو جاتا ہے۔ نہیں مجھے ٹھیک بات کہنی چاہیے، لالچی ہوتا نہیں، اس کا لاکھوں سال پرانا لالچ ڈھٹائی سے اپنا دہانہ کھول دیتا ہے جیسے کوئی آتش فشاں اپنا دہانہ کھول دے۔ یہ ایک موقع ہے، نادر موقع۔ ہم اسے گنوائیں گے نہیں۔ اسی لیے ہم نے لوگوں کے معمولات جو ایک دم بدل گئے تھے، اس میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

یہ سن کر اجلاس میں شریک سب لوگ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ سیاہ رنگ جوان بولا۔ شاید انھیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیوں کر ایک قابل مذمت شے کی تحسین کی جا رہی ہے۔

شہزادے نے انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور اپنی بات جاری رکھی تھی۔ پورٹریٹ نے کہا۔تمھیں یاد ہوگا، اس نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کی تھی کہ لالچی روح ہر طرح کی پژمردگی کا خاتمہ کرتی ہے؛ وہ اس بچے کی مانند ہوجاتی ہے جو ہر ملنے والی شے کو منھ میں ٹھونس لیتا ہے تاکہ آگے آنے والی ان دیکھی مشکلات کی تیاری کر سکے۔ لالچی روح کی نظر بھی آگے کے ان دیکھے مصائب پر ہوتی ہے۔وہ سب سے زیادہ مصلحت پسند ہوتی ہے۔ یہ میں اپنے سیاسی تجربے کی بنیاد پر بھی کہہ رہا ہوں۔تم سب میری بات سمجھ گئے ہوگے؟ یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف باری باری دیکھا جس کا مطلب انھیں بولنے کی اجازت تھا۔

سب کے لیے لازم کیا جائے کہ وہ فقط ایک ہی کتاب کا دن رات، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے مطالعہ کریں۔ پہلی تجویز تھی۔

وہ اپنے غور وفکر کو اسی کتاب تک محدود رکھیں۔ دوسری تجویز تھی۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم کسی کے خیالات کی نگرانی کیسے کر سکتے ہیں؟ ایک سوال اٹھا۔

یہ ممکن ہے۔ باقی سب کتابوں پر پابندی عائد کر دی جائے۔ فوراً جواب ملا۔

کوئی شخص خود کتاب نہ پڑھے۔ صرف ریاست کے مقرر کردہ لوگ وہی ایک کتاب پڑھ کر سنائیں اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھائیں۔ ایک اور تجویز آئی۔

لیکن پہلے پڑھانے والوں کو ایک کتاب پڑھائی جائے۔ ایک نے کہا۔

ان میں سے کوئی تجویز بھی قابل عمل نہیں۔ ولی عہد نے کہا۔انسان جلد بدل جاتا ہے۔ وہ جلد اکتا جاتا ہے۔ وہ ان چیزوں سے بھی بے زار ہوجاتا اور ان سے بھاگ جاتا ہے جن کے لیے وہ زمانے بھر سے لڑا ہوتا ہے۔وہ جلد بھول جاتا ہے۔ اپنے محسنوں کو، سخت مشکلوں کے بعد حاصل کیے گئے سبق کو، صدیوں کے تجربوں سے کشید کی گئی دانش کو۔ ہم انسانی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اس کی فطرت کے کسی اصول کو اس کے دوسروں اصولوں پر غالب کر دیں۔ انسان سب بھول سکتا ہے، ان لوگوں کو نہیں جنھوں نے اسے معمولی سا رنج پہنچایا۔(یہ کہتے ہوئے شہزادے نے سب کی طرف گہری نگاہ سے دیکھا تھا) آدمی کی انا جس قدر احسان فراموش ہے، اس سے زیادہ کینہ پرور ہے۔ہم اس اصول کی مدد سے اپنی قوم کے انسانوں کی روحوں کی نئی تعمیر کریں گے۔ کینہ پرور روحیں انسانی فطرت کی سچائی کی سب سے بڑی مظہر ہیں۔ ہم ایک سچا سماج قائم کریں گے، خواہ اس میں کتنے ہی کانٹے ہوں، زہریلے ہی کیوں نہ ہوں۔فطرت نے انسان کو کینہ

دیا ہے تو اس کو کسی نہ کسی کے خلاف استعمال کر کے انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔
اس کے بعد سب رخصت ہو گئے تھے۔ رقاصہ نے بات ختم کی۔

جس وقت یہ اجلاس ہو رہا تھا اسی وقت اسی شہر میں ایک نیا واقعہ ہوا۔ لوگ شہر سے اس طرح تیز قدموں سے نکل رہے تھے جیسے کسی باڑے سے ہانکے گئے جانور نکلتے ہیں، ایک دوسرے پر گرتے، ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے۔
کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس میں کم از کم ایک آدمی کی موت نہ ہوئی ہو۔ کچھ اموات گھر پر ہوئیں۔ زیادہ ہسپتالوں میں ہوئیں۔ پہلے پہل لوگ ہسپتالوں سے اپنے عزیزوں کی لاشیں لاتے۔ انہیں آنسوؤں میں وداع کرتے۔ چند دن مل بیٹھتے۔ ان کا سوگ مناتے۔ جب اموات بڑھنے لگیں تو لوگوں نے ہسپتالوں میں لاشیں چھوڑ کر آنے لگے۔ مرے ہوؤں کو ٹھکانے لگانا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ یہ بھی ہوا کہ گڑھا کھودا گیا، جتنی لاشیں آئیں، انھیں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی گئی۔ ہسپتال والے لاشیں گھر بھجوانے لگے تو لوگ گھروں کو چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد مرنے والوں سے زیادہ تھی۔ انھیں شہر کے پرانے حصے میں منتقل کر دیا گیا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ پہلی مرتبہ انھیں حکومت کی طرف سے غلہ فراہم کیا گیا اور انھیں ادویہ بھجوائی گئیں۔

کیا میں اکیلا تمھارا گواہ ہوں؟ یہ بات اس قالین نے کہی تھی جب اسے جلایا جا رہا تھا۔ سیاہ رنگ جوان بولا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آدمی ہر شے پہ قابو پا سکتا ہے مگر اپنے احساس جرم پر نہیں۔
سیاہ رنگ جوان نے اس پر حیرت ظاہر کی کہ کیسے ان تینوں کو بخش دیا گیا۔

میں ان آٹھ لوگوں میں شامل تھا جن پر ولی عہد بھروسا کرتا ہے اور جنھیں اس اجلاس میں شریک ہونے کا پروانہ ملا تھا۔ میں ولی عہد کے بائیں جانب بیٹھا تھا اور مسلسل پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ باقیوں کی طرح مجھے پہلے وہ لباس پہنایا گیا جسے بہ طور خاص میرے لیے بنوایا گیا تھا اور جب اجلاس ختم ہوا تو اسے واپس لے لیا گیا۔ جس وقت میں اپنا لباس پہن رہا تھا تو رنج اور غصے کی لہر میرے پورے بدن میں تیر گئی تھی۔ غصہ مجھے خود پر آیا تھا کہ کیسے میں یہ توہین برداشت کر

لیتا ہوں۔ رنج کا سبب دوسرا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ شہزادے نے طے کیا ہے کہ وہ کسی کے دل کو امن کی حالت میں نہیں رہنے دے گا۔ وہ خود کو نوع انسانی کی ذہین ترین مخلوق سمجھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے ہزاروں کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ یہ بھی دعویٰ رکھتا ہے کہ میں ان لوگوں سے باقاعدہ باتیں کرتا ہوں جو دنیا سے گزر گئے۔ اس سے بھی آگے جا کر کہتا ہے کہ وہ کہانیوں کے فرضی کرداروں سے باتیں کرتا ہے۔ ارواح اور جنوں کی زبان سمجھنے کا دعویٰ بھی کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے بات کرتے کرتے چپ ہو جاتا ہے۔ تاثر یہ دیتا ہے کہ جیسے وہ کسی سے بات کر رہا ہے۔ پھر کچھ دیر کے لیے ایسی زبان میں بات کرتا ہے جو سننے والوں کو سمجھ نہیں آتی۔ بعد میں اس کا ترجمہ کرتا ہے۔
اس جلاس میں بھی وہ تین بار چپ ہوا تھا۔ آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ کچھ دیر کسی جناتی زبان میں بولتا رہا۔ جب سب ساتوں لوگ اس کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھنے لگے تو بتانے لگا کہ وہ سب بڑے جو دنیا سے پردہ کر گئے مگر دنیا سے غافل نہیں ہیں، وہ ہمارے عظیم مقصد میں ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کی تائید ہمیں اپنے دشمنوں کی دشمنی کا مقابلہ کرنے کی ہمت دیتی ہے۔ دیوان خانے میں جہاں میں بیٹھا تھا وہاں میرے سامنے ایک تصویر تھی۔ ایک سیاہ رنگ کے جوان شخص کی تھی۔ میں نے سوچا کیا ہمارا بادشاہ اس تصویر سے بھی بات کر سکتا ہے؟ جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا، میرے ذہن میں وہ سب بات چیت چلنے لگی جو شہزادہ اس سے کر سکتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس بات چیت سے لگا کہ جیسے شہزادہ ڈرا ہوا ہے کہ وہ جوان شخص اسے قتل کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری کوئی چھپی ہوئی آرزو ہو۔ میں ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ولی عہد ایک خبطی، وسواسی مگر اولالعزم شخص ہے؛ اس سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایک بار اپنے مصاحبین کے اجلاس میں اس نے یہ کہا تھا کہ تصویریں، لکیریں، مجسمے سب باتیں کرتے ہیں۔ جس طرح آدمی کے سب اعضا اپنی زبان رکھتے ہیں جسے وہ اس وقت کھولیں گے جب چرچر کرنے والی زبان ہمیشہ کے لیے چپ ہو جائے گی، اسی طرح آدمی نے جو کچھ بھی کیا، کہا اور بنایا ہے، وہ بھی باتیں کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک تصویر اپنے خالق کے خلاف گواہی دے اور ایک شعر اپنے لکھنے والے کے خلاف استغاثہ دائر کرے۔ لیکن میں جانتا ہوں، وہ یہ باتیں کر کے اپنے شہر کے مصوروں اور شاعروں کو یاد دہانی کرواتا رہتا ہے کہ وہ اپنی جبلت پر نہ چلیں، اپنی عقل سے کام لیں اور اس کی دی ہوئی آزادی کا جائز فائدہ اٹھائیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ تصویریں، لکیریں، مجسمے آدمی کے بارے میں آدمی سے زیادہ جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے

زیادہ سوچنے اور ہر وقت خطرہ محسوس کرنے والے لوگ ہی ایسی باتیں سوچتے ہیں۔ ہوا سے ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر ہو تو اس میں کوئی نہ کوئی شگون، یا کوئی نہ کوئی مطلب نکال لیتے ہیں، ایسے لوگ۔ پر کیا کریں ہمارا پالا ہی ایسے آدمی سے پڑا ہے اور اس وقت جب انسانیت پر سب سے زیادہ کڑا وقت آیا ہے، ہم ایک خبطی شخص پر بھروسا کرنے کے سوا کچھ کر نہیں سکتے۔ جب کہ آدمی ایسے مر رہے ہیں جیسے دھنکی ہوئی روئی کے گالے اڑتے ہیں، ہمارے ولی عہد کو انسانی روحوں کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی فکر لاحق ہے۔ وہ اسے سنہری موقع کہتا ہے۔ پرلے درجے کا موقع پرست ہے۔ کون اس سے کہے کہ بھئی پہلے لوگوں کو مرنے سے بچاؤ۔ اس نے ابھی تک شہر کے حکیموں اور طبیبوں کو بلا کر یہ نہیں کہا کہ کوئی دوا تجویز یا ایجاد کریں۔ کسی نے اس طرف توجہ دلائی تو کہنے لگا کہ جس کی جیسے لکھی ہے اسے کوئی حکیم طبیب کیسے بدل سکتا ہے۔ ہم خدا کے معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ موت خالصتاً خدائی فیصلہ ہے۔ کسی انسان کو یہ اختیار نہیں کہ ایک پل کسی کی زندگی میں اضافہ کر سکے۔ لیکن میں جانتا ہوں، وہ ہر وقت نامی گرامی حکیموں سے اپنے لیے دوائیں لیتا ہے اور انھیں دوسرے ملکوں سے دوائیں لانے کے لیے بھاری رقم دیتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنے لیے دساور سے اس وبا سے بچنے کے لیے دوائیں منگوائی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ شہر میں غلہ کے گودام تیزی سے خالی ہو رہے ہیں۔ ہر ایک پر قرض بڑھتا جاتا ہے۔ لوگ ان پڑھ بیمار رہ لیتے ہیں۔ بھوکے نہیں۔ ہمارا بادشاہ بھوکے لوگوں سے ڈرتا ہے۔ اب وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح وہ کہانیوں کے کرداروں سے باتیں کر لیتا ہے، اسی طرح موت کے ڈر میں مبتلا عوام کی روحوں سے باتیں کر کے انھیں نیک بنا لے گا۔ ہم میں سے کسی میں یہ جرآت نہیں تھی کہ پوچھتے وہ کس کو نیک سمجھتے ہیں؟ لیکن میں جانتا ہوں، وہ اس شخص کو نیک سمجھتا ہے جو ویسے تو پرسکون رہے مگر اپنے فطری کینے کی آگ کو اس کے دشمنوں کے لیے بھڑکائے رکھے اور جو اپنی جان کو بادشاہ کی امانت سمجھے۔ اسی لیے چند سال پہلے جو لوگ ولی عہد کو بچاتے ہوئے مارے گئے تھے، انھیں سب سے بڑے قومی اعزازت دیے گئے اور ان کی تصاویر جگہ جگہ آویزاں کی گئیں۔ شاعروں سے ان کے لیے نظمیں لکھوا کر تقسیم کی گئیں۔

سیاہ رنگ جوان کو حیرت ہے کہ شہزادے نے کیسے ہمیں بخش دیا۔ یہ راز صرف مجھے معلوم ہے۔ دو دن پہلے جب شہزادے کو بتایا گیا کہ وہ شہر کے قدیمی حصے میں موجود جس دیوان خانے میں

ایک خاص اجلاس منعقد کرنا چاہتا ہے۔اس کی اندرونی دیواروں پر تین تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ بڑا
مرکزی دروازہ کھولیں تو پہلی نظر ایک پورٹریٹ پر پڑتی ہے۔ یہ پورٹریٹ شہزادے کے پردادا کا
ہے جس کی اٹھہترویں سالگرہ پر بنوایا گیا تھا اور شہر کے امرا نے اس کی کاپیاں بنوا کر اپنے گھروں
میں سجائی تھیں۔ اسے ہمسایہ ملک کے جلاوطن مصور نے بنایا تھا جسے دربار میں اس شرط پر رسائی دی
گئی تھی کہ وہ ہمسایہ ملک کی کچھ شہزادیوں کی تصویریں بنا کر دے گا۔ اس کشادہ نیم دائروی کمرے
کے بیچ میں کھڑے ہو کر بائیں جانب دیکھیں تو ایک سیاہ رنگ جوان شخص کی تصویر دکھائی دیتی
ہے۔ شہزادے کو بتایا گیا کہ یہ شخص صاحب خانہ کا داماد تھا۔ جوانی میں مارا گیا۔ ولی عہد کو یہ بھی بتایا
گیا کہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ خود امیر اپنی بیٹی کی خودسری پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے اس سیاہ
رنگ جوان کو زہر دلوا دیا تھا۔ وہ امیر، شہزادے کے باپ یعنی بادشاہ کے مقربین میں سے تھا مگر جس
پر بادشاہ نے ایک مستقل جاسوس مقرر کر رکھا تھا۔ یہ تصویر خود اس جوان کی بیوی نے بنائی تھی۔ جس
روز بیوہ نے اپنے مرحوم شوہر کی تصویر مکمل کی تھی، اس کے باپ نے اسے گلے لگایا تھا اور کہا تھا کہ
اچھا ہوا وہ منحوس مر گیا، ورنہ فن سے تمھارا عشق کبھی ظاہر نہ ہو سکتا۔ آدمی زندگی میں بس ایک عشق
کر سکتا ہے۔ آدمی سے عشق ہر حال میں زوال پر آتا ہے مگر فن سے عشق کبھی نہیں مرجھاتا۔ تم ہمیشہ
زندہ رہو گی! یہ سن کر اس کی بیٹی نے چاہا کہ خدا اسے اور اس کی مصوری کو ذہانت کی اس عیاری اور
بد دیانتی سے محفوظ رکھے جو اس نے اپنے باپ کی باتوں میں محسوس کی تھی۔

دیوان خانے کے عین بیچ میں کھڑے دائیں جانب دیکھیں جہاں کھڑکی ہے اور جس پر سیاہ
رنگ کا دبیز پردہ ہے، اس کے بالکل اوپر میں نظر آؤں گی۔ مجھے دیکھنے پر پہلا تاثر یہ محسوس ہوگا کہ
جیسے میں اس کشادہ کمرے میں موجود سب لوگوں کو دیکھ بھی رہی ہوں اور ان سے بے نیاز بھی
ہوں۔ شہزادے نے پیغام بھیجا کہ وہ صرف مجھے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ مجھے احتیاط سے اتار کر
اس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ شہزادے نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے پس منظر میں تاریکی ہے؛
مکمل اور خالص تاریکی۔ میں اس میں سے مسلسل طلوع ہوتی محسوس ہوتی ہوں۔ مجھ پر روشنی کہاں
سے پڑ رہی ہے، یہ خیال مجھے دیکھتے ہی آتا ہوگا۔ میں جانتی ہوں یہ روشنی صرف میرے رقص سے
پیدا ہو رہی ہے۔ مجھے نیم سرمئی، نیم قرمزی رنگوں میں بنایا گیا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے
ہوئے ہیں، ایک دائرہ بناتے ہوئے۔ میرے ہاتھوں کے بیچ، جہاں میرے کنگن پہنچتے ہیں، میرا چہرہ
دائیں رخ کی طرف ذرا سا خمیدہ، سامنے کی طرف دیکھتا ہوا، ایسے لگ رہا ہے جیسے کسی کی کھوج میں

ہو،سب کو دیکھتا مگر سب سے بے پروا۔ میری چھاتیاں باہر کی طرف اٹھتی ہوئی ہیں جنھیں میرے گلے کا ہار جیسے روکنے کی سعی کر رہا ہو۔ میری کمر کا خم انتہائی بائیں جانب ہے جو میرے بایاں پاؤں کے گھٹنے سے اٹھے ہونے کے سبب نمایاں ہے۔ ولی عہد نے میرے چہرے، سینے اور ایک ایک انگ پر بایاں ہاتھ پھیرا۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر رہا تھا۔ مجھ سے ایسے گویا ہوا جیسے کوئی پرانی شناسائی ہو۔ مجھے رقص کا یہ انداز پسند نہیں جس میں بھاری لباس بھی پہنایا گیا ہو مگر تمھارے بدن اور اس کا لوچ کمال ہے جو تمھاری بانہوں، تنی چھاتیوں، نیم برہنہ گندمی پیٹ اور پنڈلیوں سے ظاہر ہے۔ ضرور وہ مصور کسی رقاصہ کے عشق میں گرفتار ہوگا۔ میں یہ سن کر مسکرائی، کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ خوب، تمھارے خالق نے تمھارے چہرے پر مسکراہٹ کو بھی مجسم کر دیا۔ اس نے میرے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے رنگوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاید وہ اس سلسلے میں اندھا تھا۔ ایک دم میرے چہرے پر سنجیدگی چھاگئی۔ واہ! ذرا سا زاویہ بدلنے سے مسکراتا چہرہ سنجیدہ محسوس ہوتا ہے، کاش وہ مصور زندہ ہوتا تو میں اسے خصوصی انعام دیتا! اپنے دربار میں منصب عطا کرتا۔ مصوری سے مجھے عشق ہے۔ پہلے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں سجائے گا مگر یہ سوچ کر اپنا فیصلہ بدل دیا کہ مجھے روزانہ دیکھنے سے میرا طلسم جاتا رہے گا۔ وہ اپنے احساسات کے بدلنے کے وہم میں مبتلا لگتا ہے۔ ڈھلتی عمر کے لوگ سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ جملہ میرے خالق نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا جب وہ میری چھاتیوں پر کام کر رہا تھا اور وہ اسے ملنے آیا تھا اور اس نے مسلسل گفتگو عورت کی تنی چھاتیوں کے بارے میں کی تھی۔ آپ کو تو مجھے اپنی اصلیت بتا دینی چاہیے۔ مجھے اسی مصور نے بنایا تھا جس نے شہزادے کے دادا کا پورٹریٹ بنایا تھا۔ اس نے حامی بھر لی تھی کہ وہ اپنے ملک کی شہزادیوں کی تصویریں بنائے گا، حالاں کہ اس نے کسی شہزادی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ مخنث تھا اور اسے بادشاہ کے حرم اور خلوت خانے تک رسائی حاصل تھی۔ وہ صرف دربار کی رقاصاؤں کو دیکھا کرتا تھا۔ کم ازکم تین رقاصائیں ایسی تھیں جو اسے بہ یک وقت پسند تھیں۔ اس نے یہ بھی جھوٹ بولا تھا کہ اس نے اپنے ملک کی شہزادیوں کو اپنی کنیزوں کے ساتھ رقص کرتے دیکھا تھا اور وہ منظر اس کے ذہن میں نقش ہوگیا ہے، اس لیے وہ شہزادیوں کی حالت رقص میں تصویریں بنائے گا۔ اپنے خالق کو جھوٹا کہتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے، اس لیے نہیں کہ میں خود کو اس کی اس عزت کی محافظ خیال کرتی ہوں جس کی خود اسے پروا نہیں ہوتی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ جس کیفیت میں ڈوبا رہتا تھا اس میں جھوٹ سچ میں امتیاز

کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اس نے جب یہ کہا تھا کہ اس نے شہزادیوں کو رقص کرتے دیکھا تھا تو اس وقت وہ واقعی انھیں کنیزوں کے ساتھ رقص کرتے دیکھ رہا تھا اور باقاعدہ نشاط کی کیفیت بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جب مجھے بنایا تو اس وقت اس کی حالت میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ جن تین رقاصاؤں کو پسند کرتا تھا ان سب کی یادداشت کا آمیزہ سا بنا کر مجھے تخلیق کیا۔ لیکن اس کے ذہن میں یہ خیال برابر رہا کہ وہ اپنے ملک کے بادشاہ کی منجھلی شہزادی کی تصویر بنا رہا ہے۔ اس نے ملکہ کو دیکھا تھا لہٰذا میری آنکھیں اسی ملکہ کی مانند ہیں۔ لیکن میں آپ کو سچ بتاؤں میرا تعلق رقاصاؤں یا شہزادی سے اتنا نہیں جتنا ان سب مصورانہ شہکاروں سے ہے جن کا آغاز چالیس ہزار سال پہلے ہوا تھا۔ جس طرح ہر انسان میں وہ رو موجود ہوتی ہے جس کا آغاز زمین پر زندگی کی اولین دھڑکن سے ہوا تھا، اسی طرح مجھ میں وہ پراسراریت چلی آتی ہے جس نے اپنا اظہار پہلے پہل نینڈر تھال کی کھینچی گئی لکیروں میں کیا، پھر افریقا، مصر، ہندوستان، یہودی، اسلامی، چینی، یورپی مصوری میں ظاہر ہوئی۔ آدمی لوبھ اور کرودھ کا شکار ہو کر بھول بھال جاتا ہے، مگر ہم ان سے بچی ہوئی ہیں۔ اسی لیے میں یہ دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اپنے خالق سے بھی زیادہ جانتی ہوں، ہماری یادداشت خطا نہیں کرتی۔ ہماری ایک سربستہ دنیا ہے جس کا اظہار ہم صرف ان لوگوں کے سامنے کرتی ہیں جن کے حواس میں انتشار نہیں ہوتا۔ میں ولی عہد کی مانند ڈینگ نہیں مار رہی۔ لیکن یہ بات شہزادے، بادشاہ اور ان کے آبا کو معلوم نہیں۔ شہزادہ صرف میرے اس جمال سے مرعوب نہیں ہوا تھا جسے اس نے کسی انسانی شکل میں نہیں دیکھا بلکہ میرے وجود کے ایک ایک انگ کی طاقت گفتار سے سحر زدہ ہو گیا تھا اور وہ اس سحر کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جب اس کمرے میں اپنے مصاحبین سے مخاطب تھا، اسے رہ رہ کر میرا خیال آ رہا تھا۔ جس وقت وہ رخصت ہونے لگا تھا، اس نے آنکھ بھر کر مجھے دیکھا تھا۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کوئی شگون لینا چاہتا تھا۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ فن میں لازماً ایک پراسراریت ہوتی ہے اور اس کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ہے۔ وہ مجھ سے راست بات کرتا تو میں اسے بتاتی کہ پراسراریت تو ہم میں ہے مگر وہ ہماری اپنی دنیا ہے۔ اس دنیا کی اپنی زبان ہے۔ ہمیں بناتے تو آدمی ہیں مگر اکثر وہی ہماری زبان نہیں سمجھتے۔ یقین نہیں آتا تو اچھے خاصے پڑھے لکھوں کو میرے سامنے لائیں، آپ دیکھیں گے کہ وہ یا تو میری چھاتیاں دیکھیں گے یا میرا برہنہ پیٹ اور اس کے زیریں حصوں کی آرزو کریں گے۔ وہ مجھے دیکھیں گے نہ میری زبان سمجھیں گے۔ ولی عہد کو اپنے امور سلطنت کے لیے مسلسل دوسری دنیا کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، وہ اس

ی کوئی جھلک ہم میں دیکھتا ہے مگر خود ہماری دنیا اور اس کی زبان کی الف بے نہیں جانتا۔ اسے مصور اس لیے پسند ہیں کہ وہ جو چاہتے ہیں بنا کر دکھا دیتے ہیں۔ وہ مصوروں والا کام انسانی روحوں پر کرنا چاہتا ہے لیکن خود مصوروں کی طرح تنگدستی کی زندگی بالکل نہیں چاہتا۔ ہاں باقی سب کے لیے اس تنگدستی کی زندگی کے فضائل بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، جیسا کہ وہ اپنے ملک کے نامور مصور کی زندگی کو مثالی کہتا نہیں تھکتا۔ اس دیوان خانے میں وہ جب چپ ہوا تھا اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیسے وہ سہمی اور لالچی روحوں کو، جب وہ برسات کی مٹی کی طرح بیج کو قبول کرنے پر تیار ہوتی ہیں، ایک نئی صورت پر ڈھالے۔ اس لمحے اس کے ذہن میں ایک بار پھر اس ملک کا سب سے بڑا مصور آیا تھا۔ وہ جرآت مند اور احمقانہ حد تک بہادر ہے اور ایسے لوگ ناممکن کو ممکن بنانے میں یقین رکھتے ہیں مگر انسانی روح آدمی کی سب تاریکیوں کے باوجود اپنی آزادی کی حفاظت جانتی ہے۔ اسی وبا میں کچھ ایسے لوگ بھی مرے ہیں جن کی موت نے موت کی دہشت اور المنا کی کو شکست دی۔ وہ آخری لمحے تک اس شے کی جدوجہد میں مصروف تھے جو ان کے تخیل میں اعلیٰ ترین تھی۔ ان کی آنکھوں میں عجب چمک تھی، جو بتاتی تھی کہ ان کی روحیں ان سب دبیز، گھنی، دہشت ناک تاریکیوں سے بے نیاز اور سرکش ہیں جو موت کی صورت میں سامنے تھیں۔ ایک مصور بھی مرا جو اپنی آخری تصویر مکمل نہیں کر سکا مگر مرنے سے کچھ دیر پہلے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی فنکار آخری تصویر مکمل نہیں کر سکتا اور وہ مطمئن تھا۔ اس سے پہلے کہ آپ میری باتوں کو ڈینگ سمجھیں میں یاد دلا دوں کہ ہم انسانوں کی فراموشی کی عادت کا مداوا کرنے کے لیے ہی تو یہاں موجود ہیں۔

وبا اچانک ختم ہوگئی۔ نصف سے بھی کم آبادی بچی۔ بزرگ مردوں کی اکثریت تہ خاک جا بسی تھی۔ اس ابتلائے عام میں احسن اقدامات کے صلے میں ولی عہد کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ اس نے پے در پے کئی فرمان جاری کیے۔ پہلا یہ تھا کہ سب لوگ نماز شکرانہ ادا کریں اور حسب توفیق صدقہ خیرات کریں کہ خداوند کریم نے انھیں اس عظیم ابتلا میں متحد رکھا اور قوم کو ہر طرح کے انتشار سے محفوظ رکھا۔ دوسرے فرمان کے ذریعے ان آٹھ لوگوں میں سے چار (جس میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے رات کی تنہائی میں ولی عہد سے متعلق اپنے خیالات قلم بند کیے تھے) پر غداری کا الزام لگا کر قید کر لیا گیا۔ تیسرے فرمان میں ملک میں موجود سب کتابوں، تصویروں، مجسموں، موسیقی کی قسموں کی جملہ تفاصیل جمع کرنے کے لیے اور بحق سرکار ضبط کرنے کے لیے کہا گیا۔ (رقاصہ کی

تصویر اس نے اپنی خلوت گاہ میں منگوا لی)۔ اسی فرمان میں درج تھا کہ ایک جامع قانون کے ذریعے علم اور فن کی تخلیق کے جدید ضابطوں کا اعلان کیا جائے گا۔ یہ جملہ بھی درج کیا گیا کہ نئے سماج کی تعمیر قانون فطرت کے تحت کی جائے گی۔ فطرت نے بستیوں سے ان بوڑھوں کو ختم کر دیا جو پرانے علوم و فنون کو سمجھتے تھے، ہم نئے سماج میں علم اور فن کی نئی صورتیں، نئی نسل کی آرزوؤں کو سامنے رکھ کر رائج کریں گے۔ چوتھے فرمان میں ہمسایہ دشمن ملک کے خلاف جنگی تیاریوں کے لیے کہا گیا کہ جب یہ قوم مرگ عام سے لڑ رہی تھی اس نے اپنی عسکری صلاحیت میں اضافہ کر لیا تھا۔ نئے بادشاہ نے یہ بھی کہا کہ جس وبا نے آدھی سے زیادہ آبادی کا صفایا کیا وہ اسی دشمن ہی کی ایک جنگی چال تھی۔

ذکیہ مشہدی

آج کی امراؤ

بقرعید کے دن قربانی کے گوشت، کلیجی اور پچھونی سے بھرا جھولا اٹھائے چاندنی لپ جھپ گھر کی طرف چلی جارہی تھی۔ اماں اتنا سارا گوشت دیکھ کر خوش ہوجائے گی، یہ خیال بڑا مسرت آگیں تھا۔ کچھ دن سے وہ خودکفیل تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ وہ خودکفیل ہے۔ یہ تو وہ جانتی ہی تھی کہ زوار اس کا اپنا باپ نہیں ہے۔ بے شک اماں بھی کماتی تھی لیکن اماں کی کمائی ہی کتنی تھی۔ بھنے گوشت اور پراٹھوں کا تصور پیٹ میں گدگدی کررہا تھا۔ اس نے پیر اور تیز بڑھائے۔ تبھی اس کے پاس ایک چھوٹی سی کار نے زور کی آواز کے ساتھ بریک لیے۔ اسٹیرنگ وھیل پر برکت ڈون کا ایک کارندہ بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک اور مانوس چہرہ تھا جو برکت کے یہاں برابر دکھائی دیتا رہتا تھا۔ نہایت مہذب اور شریف۔ سر جھکائے نرم آواز میں گفتگو کرتا۔ کبھی کبھی اندر بھی آنکلتا اور برکت کی ماں کو اماں صاحب کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

ارے چاندنی تُو! اتنا بھاری تھیلا لیے کہاں جارہی ہے۔ گھر؟ چل پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرف تو جارہے ہیں۔ دونوں افراد جانے پہچانے تھے۔ گرمی شدید تھی۔ سورج ٹھیک سر پر آچکا تھا۔ چاندنی بے خوف وخطر بیٹھ گئی۔ گاڑی میں اے۔سی چل رہا تھا۔ قربانی کے گھر کا بہت سا کام نمٹا کر، چاروں بکروں کا خون، گوشت اور گندگی سمیٹا کر، ڈھیروں مسالہ پیس کر تھکی ہوئی لڑکی کی آنکھیں مندنے لگیں۔ بغل میں بیٹھے شخص نے ایک رومال نکالا، اس پر کوئی محلول چھڑکا اور لڑکی کے منھ پر رکھا اسے گھسیٹ کر سیٹ پر تقریباً لٹا دیا۔ چاندنی کے گھر تک لے جانے والی گلی آئی اور گزر گئی۔ سرسر کرتی گاڑی نے مزید رفتار پکڑی اور ناک کی سیدھ میں چلتی چلی گئی۔

لڑکی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ 'اوپر' کا آرڈر تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے سے کمرے میں پایا جو نہایت خوب صورت قالین اور عمدہ فرنیچر سے مزیّن تھا۔ ہاں اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ بہت اونچائی پر روشن دان تھے جو پر نظر فوری طور پر نہیں پڑتی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی نہ آس

پاس کسی کی موجودگی کا احساس تھا۔ سانس نہ ابال، بس ایک دل دہلاتی، سَن سَن کرتی خاموشی۔

چاندنی نے متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ ذہن کام نہیں کر رہا تھا لیکن پھر بھی حیرت نے غلبہ کر لیا۔ اتنا اچھا کمرہ تو برکت ڈون کے گھر میں بھی نہیں تھا۔ ہاں اس گھر میں زندگی کے آثار تھے لیکن زندگی یا موت وہ یہاں تھی کیوں۔

پھر وہ بہت پھڑ پھڑائی لیکن اس کے پر کاٹ دیے گئے۔ یہ پرانی کہانی تو مرزا رُسوا سو برس پہلے ہی بیان کر گئے اس لیے اس کی تفصیل بہت اکتا دینے والی ہوگی، الّا اس صورت کے جس میں کوئی کج ذہن ایک کچی کلی جیسی لڑکی کے جسم کو روندے جانے کی تفصیلات کو چٹخارے لے لے کر جاننا چاہیے۔ پھر بھی یہ ضرور ہے کہ امراؤ کا وقت دوسرا تھا اور چاندنی کا دوسرا۔ ان کے کلائنٹس بھی مختلف تھے۔ یہاں کوئی مہربان بسم اللہ خانم نہیں تھیں، گوہر بھی نہیں تھا۔ بیوٹی پارلر میں کام کرنے والی دو ماہر لڑکیوں نے اسے نہلا دُھلا کر اس کا میک اَپ کیا۔ بالوں کو کچھ تراش خراش کر بہترین شمپو سے دھویا نہ جانے کون کون سے لوشن لگائے۔ پھر جب وہ بلو ڈرائر (blow drier) سے خشک کیے گئے تو انھوں نے کسی آبشار کی طرح اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ لڑکیوں نے حیرت اور محبت کے ساتھ اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ کیسی پیاری لگ رہی تھی۔ صبح کے وقت اوس سے نہائے ہوئے تازہ کھلے پھول کی طرح اس کے چہرے پر خوف زدہ ہرنی کی جو کیفیت تھی وہ اسے مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔ لیکن وہ مشاطائیں (بزبان انگریزی بیوٹی ایکسپرٹس) بہت سی بظاہر معمولی نظر آنے والی لڑکیوں کو خوب صورت بنا کر پیش کرنے کے لیے کافی عرصے سے ملازمت کر رہی تھیں۔

تین دن کے بعد چاندنی کو چاندی کے طشت پر رکھ کر ایک مقامی سیاست داں کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ تین ہفتے تک وہ ان کے تصرف میں رہی۔ اس دوران اس نے بہترین کپڑے پہنے جو پہننا تو دور اس نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ کھانے کھائے جو کھانا تو دور، ان کے نام تک نہیں سنے تھے، وہ خوشبوئیں لگائیں جو کبھی اس کے پاس سے بھی ہو کر نہیں گزری تھیں اور وہ (فحش) ویڈیو دیکھے جن کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ (ان کو دیکھنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور کان جلنے لگے تھے اور احساس گناہ نے یوں گھیر لیا تھا جیسے سیلاب کا پانی کسی بے بضاعت جھونپڑی کو گھیر لیتا ہے۔)

وہ ایک دردناک لذت سے دوچار تھی۔ یہ سارا کچھ بڑا دل خوش کن تھا۔ لیکن ساتھ ہی اسے اپنی ماں، اپنا گھر، بھائی حتیٰ کہ وہ بے مروت سازِ ندہ بھی بہت یاد آ رہے تھے۔ اس نے اپنے

اذیت دھندوں سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ ایک بار ماں سے بات کرا دیں وہ کم از کم یہ بتا دے کہ وہ خیریت سے ہے لیکن اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں کی گئی۔ باقی وہ جو چاہتی فوراً پورا کر دیا جاتا۔

چاندنی کا 'کلائنٹ' اس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتا تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی اس کے پختہ اور کھائے کھیلے، چہرے پر ایسی مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی جو اس کی ساری خباثت کو دھو پونچھ کر اسے بڑا پیارا بنا دیتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسی پیاری سی ان چھوئی ننھی چڑیا اس کے ہاتھ پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ معصوم۔ ہر چیز سے خوش ہو جانے والی۔ جب سے بیوی میں باسی پن محسوس کرنے کے بعد اس نے 'تحفے' میں عورتیں قبول کرنا شروع کی تھیں اسے اس طرح کا لطیف احساس نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی لوگ پکی پکائی بار ڈانسرز تھما جاتے تھے۔

پھر زیادہ وقت نہیں لگا۔ چھ۔ آٹھ مہینوں کے اندر چاندنی اپنی پرانی کثافت بھری دنیا کو بھولنے لگی۔ اس کا جسم بھر گیا۔ رنگ نکھر کر پکے گیہوں کی بالی جیسا ہو گیا۔ بالوں میں بھٹوں کا ریشم سما گیا۔ اسے ایک چھوٹے لیکن خوب صورت فلیٹ میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں دروازے پر باوردی گارڈ رہتا تھا اور ایک ٹیوٹر آنے لگا تھا جو اسے عام بول چال کی انگریزی سکھاتا تھا۔ ایک نوجوان عورت اسے جدید طرز کے آداب نشست و برخاست کی تربیت دیتی تھی۔ دونوں ملائمیت سے پیش آتے لیکن جیسے دور دور سے، اور ماں یا برکت ڈون سے رابطہ کرانے کے نام پر تو یوں بدکے تھے جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

اب وہ مزید ہاتھوں سے گزرنے لگی تھی۔

پھر ایک دن ایک شخص آیا۔ موٹا، پستہ قد لیکن اس کا لباس بہت عمدہ تھا اور اس سے بہت ہی لطیف خوشبو آتی تھی۔ اس نے پور پور انگشتریاں پہن رکھی تھیں جن میں مختلف پتھر جڑے ہوئے تھے۔ چاندنی ان کی حیثیت سے آگاہ نہیں تھی۔ اگر آگاہ کیا بھی جاتا تو اسے اتنی گنتی نہیں آتی ہوتی۔ پانچ سو کے بعد اس کے ذہن کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔

وہ شخص چاندنی کو کروز پر لے گیا۔

کروز رکئی منزلہ تھا۔ سمندر تو اس کے لیے حیرت کا سبب تھا ہی، کروز ر میں داخل ہوئی تو اس نے دانتوں تلے انگلیاں دبا لیں۔ سمجھ میں نہیں آیا وہ خواب دیکھ رہی ہے یا یہ حقیقت ہے۔ باقاعدہ کمرہ، اس میں بچھا ہوا ایسا قالین جس میں پیر دھنسیں۔ صوفہ، بیڈ، فرج، دیوار میں پوشیدہ بار۔

بلوریں پیالے میں پھل۔ ٹی۔وی۔ غرض کہ کیا کچھ نہیں تھا۔ یہ شخص کچھ زیادہ عمر کی وجہ سے اسے پسند نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا ابتدائی لمس بڑا فرحت انگیز تھا۔ اسے معاً خیال آیا کہ وہ باپ سے ایسے ہی معانقے کی خواہش مند ہوتی جس میں گلے لگ کر، بازوؤں میں سما کر تمام آفاتِ ارض و سماوی سے محفوظ ہونے کا احساس پیدا ہو۔ (لیکن اس کے باپ نے تو کبھی بچوں کو پیار ہی نہیں کیا۔ یا شاید کر نہیں سکا) ہاں جب اس شخص نے بوسے بازی شروع کی تو پہلی مرتبہ چاندنی کو ایک مرد کے جسمانی قرب سے گھن کا احساس ہوا۔ لیکن اس کے سامنے کوئی چوائس نہیں تھا۔

رات کے پچھلے پہر وہ چاندنی کی انگوٹھی میں سما جانے والی کمر میں ہاتھ ڈال کر عرشے پر آیا تو ایک بار پھر اس چھوٹی لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس حیرت میں قدرے خوف بھی تھا۔ اس دنیا میں کتنا کچھ ہے دیکھنے کے لیے۔ اپنی گلی میں اس نے کیا دیکھا تھا۔ اس سمندر سے نکلا ایک قطرہ۔ وہ بھی اس پانی کا جسے لوگوں نے گندا کر رکھا تھا۔ اس نے متوحش نظریں دوڑائیں۔ یہاں نہ اور تھا نہ چھور، سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بیکراں، بے پناہ، لامکاں، لامحدود۔ ایک خوف ناک حسن کا حامل زندگی کی طرح جس کے جلو میں موت ہٹو۔ بچو کرتی چلتی ہے۔ اس سمندر کے اوپر ویسا ہی بے کراں اور بے پناہ آسمان تھا۔ رات کی وجہ سے اس کے نیلگوں رنگ میں سیاہی گھل گئی تھی اور ستارے زیادہ آب و تاب سے چمکنے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دور کہیں ایک سفید رنگ کے دیوقامت جہاز کا ہیولیٰ نمودار ہوا ساتھ ہی سورج نے افق پر غازہ چھڑکنا شروع کیا۔ بڑی خنک، ملائم ہوا سر سر کرتی پانیوں پر دوڑتی لہروں پر چاندی کے جھاگوں سے کناری بناتی دوڑ گئی۔ یہ کہاں آ گئی ہے وہ؟ یہ کون سی دنیا ہے؟ تنگ گلیوں کے اندر بسی اس گندی، شور مچاتی دنیا سے اس قدر مختلف جہاں سے وہ آئی ہے یا لے آئی گئی ہے۔ زوّار؟ لاحول ولاقوۃ۔ اور وہ حاجی۔ اس کا دل قدرے کانپا۔ کیا وہ حاجی کے پاس واپس جا سکتی ہے؟ یہ وہ سمجھتی تھی کہ کوئی لڑکی گھر سے چھ مہینے غائب رہ کر واپس لوٹے تو وہ کسی حاجی کے گھر کی بہو نہیں بن سکے گی اور کیا حاجی کی بھی دلچسپی اس میں برقرار رہ گئی ہوگی؟ پھر اس کی صورت، اس کی داڑھی، اس کی سانسوں میں پان مسالے کی تیز خوشبو، اس کی ویسی ہی تین آنکھوں والی اماں۔ کیا اب وہ خود حاجی یا اس جیسے کسی دوسرے 'شریف' انسان کو قبول کر سکے گی۔ اس کے گھر میں سِل پر بیٹھ کر مسالہ پیسے گی، بقرعید میں مانگنے کی پچوٹی کو دھو دھو کر اندر کی گندگی صاف کرے گی؟ لیکن کیا ان مہنگے، شوکیسوں میں سجے گڈوں جیسے لوگوں میں سے کوئی اس سے شادی کر کے اپنی دلہن بنائے گا۔ سچ مچ کی دلہن؟ امید تو

نہیں کہ اسے دلہن بنانے کے لیے کوئی ڈنڈے سے بھی چھوئے گا۔ نہ حاجی نہ ان میں سے کوئی۔ کوئی بھی تو نہیں۔

اس نے اپنا چکراتا ہوا سر اس شخص کے کاندھوں پر رکھ دیا اور آنکھیں موندلیں۔ ''اماں، تم کہاں ہو۔'' اس نے اندر ہی اندر آواز لگا کر ماں کو پکارا۔ ''مجھے ڈھونڈتی تو ہوگی۔ کیا گھر کے اور لوگ بھی یاد کرتے ہیں؟ یا کہتے ہیں خاک ڈالو۔ نہ جانے کس کے ساتھ نکل لی۔ تم کیا سوچتی ہو اماں۔ ہم کیسے جائیں۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں۔ ہم تو عیش کر رہے ہیں۔ بس ایک بار تم سے بات کر پاتے۔ تمہیں تسلی دے دیتے۔ یہ بھی کہہ دیتے کہ جو ہو رہا ہے وہ ہمارے بس میں نہیں تھا۔ تم کہتی ہو نا کہ ہر بات میں اللہ کی مرضی شامل ہوتی ہے۔

صبح کا اجالا پوری طرح پھیل کر شام میں تبدیل ہوا اور شام نے رات میں مدغم ہو کر اس کے لیے جگہ چھوڑی۔ دن، مہینے، ہفتہ مکمل ہوا۔ ہفتے مہینوں میں بدلے، مہینوں نے سرک سرک کر سالوں کے لیے جگہ بنائی۔ زندگی کے بے کراں، بے پناہ، خوف ناک (اور بیک وقت حسین) پانیوں پر چاندنی کا کروز رواں رہا۔ پانچ سال گزر گئے۔

باباجی کی پیشین گوئی۔

چندا بی بی کے آنسو اب خشک ہو چلے تھے۔ بس کبھی کبھی دل میں ایک ٹیس اٹھتی تھی۔ خاص طور پر جب کوئی بظاہر ہمدردی سے لیکن بہ باطن طنزیہ انداز میں (جو چھپائے نہ چھپتا تھا) چاندنی کا ذکر کرتا تھا لیکن جب وہ کیکی کی شادی طے ہو جانے پر لڑکی کے گھر آئے پانچ پانچ کھجلے اور لڈوؤں کا حصہ لے کر اپنی ہمراز سہیلی سرسوتی کے گھر گئی تو اس نے دلی ہمدردی سے کہا'' آج چاندنی اور یاد آرہی ہے۔ اس حرامی بابا نے اچھی موٹی رقم بھی پھوس لی اور لڑکی کا اتا پتا تک نہ چلا۔ بہن کے بیاہ میں بہن ندارت۔ ادھر پھر کبھی گئی تو رے چندا۔'' پھر چندا کے آنسو اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔ اس نے سستی سنتھیٹک ساری کے آنچل سے آنکھیں پونچھیں۔

چندا جھٹے سے اکھڑ گئی۔ ''اب کیا کرنے کو جائیں او کے پاس۔ روز دن کہے تھا لڑکی آج آجائے گی کہ کل۔ ہم تو اب اس کے دوارے موتنے نہ جائیں۔ دو ہزار نقد۔ ایک ہزار سے زیادہ کا سامان۔ اور لڑکی آئی نہ پتہ چلا کہ کہاں گئی ہے بھی کہ مرگئی۔ مری ہوئی بھی تو پتہ چلتی رے تُرنتی۔ مرے کا صبر آجا ہے۔'' اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے بھی کثیف ساری کے چھور سے آنسو خشک کیے۔ چاندنی کی یادوں پر ڈھول بھلے ہی پڑنے لگی ہو لیکن اس کے جانے کے بعد چندا

اپنا سایہ بن کر رہ گئی تھی۔ زوار کی زندگی میں آنے کے بعد وہ صاف ستھری رہا کرتی تھی۔ بھر بھر ہاتھ چوڑیاں پہنتی (خواہ وہ نکاح کیے بغیر ہی رہ رہا ہو۔) پیشانی پر ننھی سی کاجل کی بندی لگاتی۔ اب اسے کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کیسی پھوہڑ، کثیف، بدبودار ہو گئی ہے۔ زوار اس سے بدکنے لگا تھا۔ کئی بار دھمکی دی کہ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ چندا پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ ہاں اب بیکی کی شادی کے لیے دل پسند لڑکا مل جانے سے وہ کچھ خوش خوش رہنے لگی تھی۔ لیکن آج سرتی نے ہمدردی کے دو بول ایک بار پھر بول کر زخم کے کھرنڈ نوچ دیے تھے۔

تبھی ایک دن چندا نے وہ خواب دیکھا۔

چاندنی لوٹ آئی ہے۔ ایسا خواب شروع میں وہ روز دیکھتی تھی لیکن سوتے ہوئے۔ ابھی تو وہ دروازے پہ کھڑی سائیکل پر گٹھری لاد کر سستی ساریاں بیچنے والے سے سودا کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ساری کا ڈھیر پرے دھکیلا اور آنکھیں ملیں۔ یہ چاندنی ہے یا اس کا بھوت۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، لاغر جسم۔ ایک بیس سال کی اٹھتی جوانی کا ڈھلکا ہوا سینہ۔ چہرے پر کھنڈی زردی۔ سکڑی سمٹی سی، ذرا دور کو کھڑی وہ ایک ٹک چندا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بے آواز آنسو اس کے گالوں سے بہہ کر اس کا پورا چہرہ بھگو رہے تھے۔ چندا بی چند لمحے منھ پھاڑے کھڑی رہیں پھر انھوں نے بجائے دوڑ کر لڑکی کو لپٹانے کے ایک شدید اضطراری کیفیت کے تحت اسی جگہ گول گول گھومنا اور گھوم گھوم کر کودنا شروع کیا۔ چاندنی آ گئی۔ چاندنی آ گئی۔ ہمری چاندنی، ہمری چاندنی۔

تب چاندنی خود ہی قریب آئی۔ اماں، ہاں ہم ہی ہیں، تمہاری چاندنی۔ پھر اس نے اپنے آنسوؤں کو آواز دی آجاؤ۔ رلائی جیسے کلیجے سے پھوٹ رہی تھی۔ جیسے اس کا باپ آج ہی مرا تھا۔ جیسے اس وقت جو وہ روئی نہیں تھی وہ فرض آج پورا کر رہی تھی۔ چندا بی اپنے آنچل سے اس کا منھ پونچھنے اور بار بار اسے چومنے لگیں۔ تبھی بہو باہر نکلی اور دونوں کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔

شام کو زوار آیا۔ اسے لگا جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ ارے چاندنی؟ یہ کہاں سے ٹپک پڑی۔ کہاں تھی۔ ہم نے تو تیرا فاتحہ درود بھی کر لیا تھا۔

چندا بی بھڑک گئیں۔ کیا منحوس بول بولتا ہے۔ جا جا کے مٹھائی لے کے آ۔ قبرستان والے بابا کو دے کے آئیں گے۔

لڑکوں نے قدرے مشکوک نظروں سے بہن کو دیکھا۔ پتہ نہیں کہاں رہ کے آئی ہے، کس طرح رہ کے آئی ہے۔ چندا بی نے لڑکی سے بغیر کچھ پوچھے کہا۔ لوگ پکڑے گئے تھے۔ ایک

گھر میں نوکرانی کا کام کرنے کو بیچ دیا۔ ایسی چیل کی نظریں رکھیں کہ بے چاری اتنے دن بندھی رہی۔ فون نمبر تو کسی کا یاد تھوڑی رہے ہے۔ دس۔ دس نمبر کا ایک فون۔

تو اب کیسے آگئی؟

بھاگی ہوگی، موقع مل گیا ہوگا۔

چاندنی نے دل ہی دل میں ماں کی بلائیں لیں۔ اس نے بہت سی وضاحتوں سے بچا لیا تھا۔ زوار نے کہا۔ ''دیکھ نہیں رہے ہو ٹبیا ہی (ٹی بی زدہ) لگ رہی ہے۔ نکال دیا ہوگا۔ کیوں ری تیرے ساتھ کسی نے غلط کام تو نہیں کیا؟''

چندا بی بی پھر ناراض ہوگئیں۔ ساری دنیا تمہاری جیسی نہیں ہے۔ پھر انھوں نے لڑکے سے مرغی لانے کو کہا۔ مرغی کا شوربہ پئے گی تو طاقت آئے گی۔ بھاگی ہے تو ڈرتی ڈرتی آئی ہوگی۔ جانے کتنی تکلیفیں جھیلی ہوں گی۔ اسی لیے بیمار اور کمزور ہوگئی ہے۔

صبح کام پر جاتے وقت زوار نے چاندنی کے بیگ سے ایک دو پتے دواؤں کے نکال لیے۔ اس نے اسے رات اور صبح دونوں وقت دوا کھاتے دیکھا تھا۔ لڑکی کی صورت اور حبثہ بھی محض تھکن اور خوف کا نتیجہ نہیں رلگ رہا تھا۔ وہ بہت بیمار لگ رہی تھی۔

محلے کے ڈاکٹر نے کہا ٹی۔ بی کی دوائیں ہیں۔ لڑکی بہت دن باہر رہ کے آئی ہے۔ دوسرا خطرہ بھی ہوسکتا ہے۔

''کینسر؟''

کینسر کا باہر رہ کر آنے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انھوں نے بس اتنا ہی کہا۔

''تو؟''

''اس کے پاس جانچ کے کوئی کاغذ ہوں تو وہ لے کر آؤ۔''

زوار نے چندا بی بی کو سمجھا بجھا کر چاندنی سے اچھی طرح پوچھنے اور پوری معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ جاتا رہتا تھا اور بڑا گھاگھ ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ کا ایک ڈرائیور ہائی وے پر دھندہ کرنے والی عورتوں کو اٹھا لیا کرتا تھا اور پھر واپسی میں انھیں واپس چھوڑ جاتا تھا۔ اس کی موت ایڈز سے ہوئی۔ پھر معلوم ہوا اس کی بیوی اور نوزائیدہ بچے کو بھی یہی مرض نکلا۔ یہ خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ تھا جن کی عورتیں دھندہ کرتی تھیں۔ ان کے سماج میں اسے قبول کیا جاتا تھا۔ لیکن جب ایڈز کا پتہ چلا اور کچھ سوشل ورکرز نے انھیں اس سے واقف کرایا

تو انھوں نے ماں بچے کو ٹاٹ باہر کر دیا۔ باوجود اس کے کہ ان لوگوں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مرض صرف ساتھ رہنے، کھانے پینے حتیٰ کہ کپڑے بھی استعمال کر لینے سے نہیں ہوگا۔ کیوں اور کیسے ہوگا یہ بھی سمجھایا تھا۔ وہ بے چاری عورت بچے کے ساتھ کہاں گئی، اس کے ساتھ آگے کیا ہوا، زوار کو نہیں معلوم تھا۔

چاندنی کے عمدہ کوالٹی کے بیگ سے کچھ بہت اچھے کپڑے، پرس، جوتے اور ان کے ساتھ چالیس ہزار روپے نکلے۔ کسی قسم کی جانچ کے کوئی کاغذ نہیں تھے۔ نسخہ تھا اور بہت سی دوائیں۔ وہ ساری دوائیں ٹی-بی کی تھیں۔ زوار نے ان لوگوں کا پتہ جاننے کے لیے بڑی جرح کی جن کے یہاں سے وہ بھاگی تھی لیکن چاندنی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ممبئی بہت بڑا شہر ہے۔ ایک ایک محلہ ایک ایک شہر کے برابر ہے۔ اب ہم کہاں تھے ہمیں نہیں معلوم۔ بیماری کی وجہ سے کام نہیں کر پاتے تھے۔ گھر کے لوگوں کو چھوت لگنے کا بھی ڈر تھا۔ سو پانچ ہزار روپے، کچھ سامان، دوا اور پٹنہ کا ٹکٹ دے کر گاڑی پر بٹھوا دیا۔ جس نے بٹھایا وہ ان کے گھر کا آدمی نہیں تھا۔ اسے ہم بالکل نہیں پہچانتے تھے۔ اے-سی گاڑی میں بٹھایا تھا۔

وہ دن بہ دن کمزور ہوتی گئی۔ چندا بی بی کے پہلے تو کام چھوڑ دینے کی سوجھی کہ لڑکی کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں، لیکن پھر خیال آیا کہ مہینے کے پانچ چھ ہزار گھر لا رہی ہیں۔ آمدنی بند ہوئی تو بیٹے کبھی بھی بہن کے لیے اتنا نہ خرچ کریں گے۔ ایک کا تو اپنا کنبہ ہے ہی، دوسرے کی بھی شادی ہونے والی ہے۔ وہ اس کے لیے دودھ خریدتیں۔ پھل اور مرغی لے کر آتیں۔ جتنی دیر گھر میں رہتیں، اس کا چہرہ دیکھتی رہتیں۔ کبھی لگتا نہ بچے گی تو سوچتیں گھر تو آ گئی۔ بلا سے نہ بچے۔ پردیس میں مر مرا جاتی، دوسرے مٹی منزل کرتے۔ ہمیں پتہ تک نہ چلتا کہ ہماری لڑکی کا ہوا کیا۔ اب جو ہونا ہے نظر کے سامنے ہو۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔

چاندنی کی 'مٹی منزل' انھوں نے ہی کی۔ بہن کی بارات کے عین ایک دن پہلے اس کی حالت بگڑی اور ماں کی گود میں سر رکھے رکھے اس نے آخری سانسیں لیں۔

چاندنی جب عالم نزع میں تھی تو اتفاق سے زوار موجود تھا۔ اس نے کہا، "کلمہ پڑھ چاندنی۔" چاندنی نے اسے یکسر نظرانداز کر کے ماں کے چہرے پر ڈوبتی نظریں دوڑائیں اور ساری قوت یک جا کر کے بولی ---"اماں، شادی مت روکنا۔ کیکی کو رخصت۔--- اور خود رخصت ہولی۔

اس کی وصیت کے مطابق کیکی کا نکاح کر کے اسے رخصت کر دیا گیا۔ ڈھولک، گیت اور رسمیں نہیں ہوئیں۔ سادہ شرعی نکاح ہوا۔ ہاں دولہا میاں کی جو فرمائشیں تھیں ان کا اہتمام تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چاندنی اپنے ساتھ جو بڑی رقم لائی تھی وہ اس نے پوری کی پوری ماں کی تحویل میں دے دی تھی۔

ذکیہ مشہدی

نور جہاں

محلے میں اس دن شامیانہ لگ رہا تھا۔ حسب دستور بیچ سڑک پر بس ایک چوڑی پٹی چھوڑ دی گئی تھی کہ رکشے اور سائیکلیں نکل جائیں۔ تب موٹریں قطعی عام نہیں تھیں۔ بس سرکاری گاڑیاں ہی کبھی کبھار نظر آجاتیں۔ جہاں کہیں شادی بیاہ ہوتا سڑک پر شامیانہ لگ جاتا۔ لوگ ان شامیانوں کے اس قدر عادی تھے کہ باوجود دقت کے کچھ نہ کہتے۔ کبھی کبھار کوئی راہ گیر پوچھ بیٹھتا ''کا ہو بھیا، کیکر بیاہ ہے؟'' یا ''اچھا، چھوٹے لال گپتا کے تین لڑکین کے بعد بٹوا بھوا رہا، وہی کا کچھ ہے کا؟'' ہندو حضرات کے یہاں شامیانے کے نیچے لانبی لانبی چٹائیاں بچھا کر ڈھاک کے پتلوں پر کھانا پروسا جاتا۔ پنگھت بیٹھ جاتی تو کھانا کھلانے والے پیتل کی بالٹیوں میں دال، سبزی، رائتہ لیے ہوئے پیتل کی کڑچھیوں سے چیزیں پتّل پر ڈالتے جاتے۔ پیچھے سے ایک شخص بانس کی نئی ٹوکری میں پھولی پھولی گرم پوریاں اٹھائے چار چار پوریاں رکھتا جاتا۔ مٹھائیاں، اچار، نمک پہلے سے پتّل پر رکھے ہوتے۔ ذرا زیادہ نفاست برتنے والے لوگوں کی یہاں مٹھائی الگ چھوٹے چھوٹے پیالے نما دونوں میں دی جاتی۔ پوریوں کے ساتھ خستہ کچوریاں بھی ہوتیں۔ کھانا شروع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد لوگ پھر بالٹیاں اور ٹوکریاں لیے گھومنے لگتے۔ اس بار آواز لگاتے جاتے دال، دال، دال۔۔۔ سبجی، سبجی۔۔۔ پوڑی پوڑی کچوڑی۔۔۔ جس شخص کو جو چاہیے ہوتا وہ اس کے لیے کھلانے والے کو روک لیتا۔ مسلمانوں کے یہاں چٹائیوں کی جگہ جازم ہوتی۔ میلی میلی لانبی سفید چادریں اور کھانے کے لیے رکابیاں رکھی جاتیں۔ زیادہ تر تانبے کی، کہیں کہیں تام چینی کی اور غریب غربا کے یہاں مٹی کی بھی۔ نان، قورمہ، پلاؤ اور زردہ عام کھانے تھے۔ کہیں کہیں فیرینی اور شیرمال کا اضافہ ہوجاتا تھا۔ جب بھی دعوت ہوتی پورا محلہ خوشبوؤں سے گمک جاتا۔ محلے میں تنور گڑتا تو آس پاس کے گھروں کی خواتین اپنے یہاں سے خمیر کیا ہوا آٹا بھجوا دیتیں۔ صاحب تقریب کے یہاں کا کھانا پک چکتا تو معمولی سی اجرت لے کر باورچی دو چار گھروں کے لیے نان نکال دیتا۔ نان پکوانے والی بیبیاں اس دن گھر میں آلو گوشت یا قورمے کا اہتمام کرتیں۔ ویسے تقریب کسی کے گھر میں ہو،

دعوت سارے محلے کی ہوا کرتی تھی۔ گاؤں میں تو پورا پورا گاؤں مدعو ہوتا۔ شادی کی دعوت ہوتی خصوصاً دعوت ولیمہ تو جو لوگ نہیں جاتے ان کا کھانا گھر بھجوایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں بچا ہوا کھانا بھی تقسیم کر دیا جاتا۔ گھروں میں کام کرنے والی ملازمائیں، دھوبن، جمادارن اور ازیں قبیل عورتیں پلاؤ خشک کرکے رکھ لیا کرتی تھیں۔ گوشت یا ہندو گھروں سے ملنے والی مسالے دار ترکاریاں گرم کرکے رات کو چھینکوں میں رکھ کر کھلی ہوا میں لٹکا دیتیں۔ اس طرح وہ ہفتہ ہفتہ بھر چل جایا کرتی تھیں گرچہ آخر میں مزے سے اتر جایا کرتی تھیں لیکن جہاں زندگی پر پیٹ حاوی ہوتا ہے وہاں زبان کنارہ کش ہو جایا کرتی ہے۔

ہا ہا ہا۔۔۔ ارے تمہارے ابا دوسری شادی کررہے ہیں کیا؟ وصولپاڑی نے حکیم انوار کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے شیخ طاہر اور حالیہ 'حاجی' طاہر کے بیٹوں کو انتظام میں پیش پیش دیکھ کر زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔ وصو دوسرے محلے میں رہتے تھے اور ادھر کافی دن بعد اس طرف کا چکر لگا یا تھا۔

لڑکوں کے چہرے پر کبیدگی کے آثار نمودار ہوئے، لیکن تب زیادہ تر لڑکے بڑوں کے منھ نہیں لگا کرتے تھے۔ تاہم اب وہ ایسے لڑکے بھی نہیں رہ گئے تھے۔ شادی شدہ تھے اس لیے ایک نے ذرا تلملا کر جواب دیا ''ابا حج کر کے آئے ہیں۔''

''ارے یہ حرام زادہ حج کر آیا'' وصو اب اندر داخل ہو چکے تھے۔

''وصو میاں ذرا زبان پر قابو رکھا کیجیے۔ شیخ طاہر سفید داڑھی والے بزرگ ہیں۔ داڑھی کی آڑ میں وہ کچھ بھی کررہے ہوں لیکن آپ کو یہ زیب نہیں دیتا۔'' حکیم انوار نے سخت لہجے میں انھیں تنبیہ کی۔

''آپ کو پتہ ہے اپنے سگے جواں مرگ بیٹے کی بیوہ کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا ہے؟''

''ہم اسی محلے میں رہتے ہیں۔ آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم نے دعوت قبول نہیں کی ہے۔''

''پھر بھی حرام زادہ کہنے پر اعتراض کررہے ہیں۔ چلیے دعوت تو آپ کے بدلے ہم کھا آئیں گے۔ بڈھے کا مال خرچ ہونا چاہیے۔'' انھوں نے ایک سانس میں کہا۔

شیخ طاہر علی کا مرادآبادی برتنوں کا کاروبار تھا۔ بڑے لڑکے ناصر علی نے کچھ دن بعد اپنا چولہا اور دوکان الگ کر لی تھی۔ اس کا انھیں اور ان کی اہلیہ کو بہت ملال تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سارا کیا

دھرا ناصر کی بیوی کا ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ تبھی ناصر کو ٹی۔بی ہوگئی۔ اس وقت ٹی۔بی کا علاج نہیں تھا۔ (نامی گرامی، متمول گھرانے کی بہو کملا نہرو نے بھی ٹی۔بی میں ہی انتقال کیا تھا اور بعد میں جناح کی محبوب بیوی رتی نے بھی) لوگ عموماً بھوالی سینی ٹوریم بھیجے جاتے تھے کہ پہاڑ کی آب و ہوا سے ٹھیک ہوں گے۔ ناصر کو اس کی بیوی اور سسرال والے لے کر بھوالی گئے۔ بچے بھی ننہال نے ہی سنبھالے۔ کچھ عرصے بعد ناصر بظاہر صحت یاب ہو کر لوٹ آیا لیکن سسرال والوں کی مدد کے باوجود اس کی دوکان کا بیش تر سرمایہ اس کے علاج میں خرچ ہو چکا تھا۔ باپ نے کوئی مدد نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ دوکان تو انھوں نے ہی بیٹے کو کروائی تھی۔ پھر یہ کہ ان کا خیال تھا کہ سمدھیانہ متمول ہے وہ سنبھالے داماد کو۔

ناصر کچھ عرصے بعد پھر دوبارہ کھانسنے اور خون تھوکنے لگا۔ لڑکھڑاتے بزنس کو سنبھالنے میں وہ بھاگ دوڑ بھی کچھ زیادہ ہی کر رہا تھا۔ بیماری پلٹی تو اس نے بھوالی جانے سے بھی انکار کر دیا اور جلد ہی چل بسا۔ مرنے سے صرف ایک دن پہلے اس نے بیوی سے کہا تھا، ''نور، ہماری بڑی خواہش تھی کہ ہم پڑھیں۔ ہائی اسکول کے بعد ہی ابا نے دوکان پر بٹھا دیا۔ بائیس کے ہوئے تھے کہ شادی بھی کر دی۔ تم بچوں کی پڑھائی مت چھڑوانا۔ جیسے بھی بن پڑے اعلیٰ تعلیم دلوانا۔'' پھر اس نے قدرے رک کر کہا۔ ''ہم کچھ چھوڑ کر نہیں جا رہے۔ تم جوان ہو، دوسری شادی بھی کر سکتی ہو۔ کر لینا۔ مگر ایسے شخص سے جو رحم دل ہو۔ میرے بچے رُلیں نہیں۔''

نور جہاں نے آنسو پونچھ دیے۔ اس نازک گھڑی میں بھی وہ خفا ہو گئی تھی۔ غصے سے بولی، ''ہم کیا مرد ہیں کہ دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے ہوتے کوئی ہم سے شادی کرے گا اور یہ کہ ہم رضامند ہو جائیں گے؟ ہاں ہم مرتے تو تمھارے ابا ہماری قبر کی مٹی سوکھنے سے پہلے تمھارا سہرا گندھوانے کو مالی بٹھا دیتے اور تم چل دیتے نکاح پڑھوانے بغیر دیکھے کہ لڑکی رحم دل ہے یا نہیں۔''

وہ دوبارہ رونے لگی۔ ''تم خاطر جمع رکھو ناصر صاحب۔ ہم دونوں بیٹوں کو ہی نہیں، بیٹی کو بھی پڑھائیں گے۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تمھارے دل میں کوئی رنج، کوئی وسوسہ نہ رہے۔'' اس نے مضبوطی سے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور باقی ساری رات خاموشی سے اس کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اسے یہ بھی نہیں محسوس ہو سکا کہ کن لمحوں میں ناصر نے دم توڑا۔ ایسی پُرسکون موت تھی اور زردی کھنڈے چہرے پر ایسی ملکوتی وجاہت کہ ہر شخص کہہ رہا تھا کہ یقیناً اسے جنت کی بشارت ملی ہوگی۔

''ہاں ملی تو تھی۔ ہم نے دی تھی نا۔'' نور جہاں نے سوچا اور ایک آنسو نہیں بہایا۔

پھر لوگوں نے ایک انہونی دیکھی۔

نورجہاں نے دوکان کا بچا کھچا مال بکوا دیا، پائدان والی سلائی مشین خریدی، بچے پیسے ڈاک خانے میں جمع کرائے، دوکان کرایے میں لگادی اور اس نے جس کی ہم نام خاتون سترہویں صدی میں ہندوستان کی ملکہ تھی، محلے والوں کے کپڑے سینے شروع کیے۔

شیخ طاہر علی اور ان کی اہلیہ نے بہو کے خلاف ایک مہم چھیڑ دی کہ وہ خاندان کا نام بدنام کر رہی تھی۔ بچے درزن کی اولاد کہلائیں گے۔ بیٹی کی شادی میں دقت ہوجائے گی وغیرہ وغیرہ۔ گھر کے جس حصے پر ناصر قابض تھا اس کا بیش تر حصہ اس داستانی اونٹ کی طرح، جس نے پہلے صرف اگلے پیر اندر رکھنے چاہے تھے، انھوں نے رفتہ رفتہ اپنے قبضے میں یوں کرلیا کہ نورجہاں صرف ایک کمرے اور ایک برآمدے میں محدود ہوگئی۔ اس مختصر سے حصے میں اس کا چولہا تھا، اس کی مشین تھی اور تین بچوں کے ساتھ کی پوری گرہستی۔

پھر جب طاہر علی کی داڑھی میں سفید بالوں کی تعداد سیاہ سے زیادہ ہوگئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وقت آگیا ہے کہ وہ حج کے فرض سے سبک دوش ہوجائیں۔ اس زمانے میں لوگ پانی کے جہاز سے حج کو جایا کرتے تھے۔ خاصا صبر آزما اور طویل سفر ہوا کرتا تھا۔ اوپر سے حج کے ارکان بھی زبردست آزمائش ہوا کرتے تھے اس لیے کہ عرب میں بھی وہ سہولیات نہیں آئی تھیں جو آج لوگوں کو میسر ہیں۔ اپنی عمر کے پیش نظر شیخ طاہر علی نے دوسرے اسباب کے ساتھ وصیت بھی تیار کرائی۔ ناصر کے بچے مجوب قرار دیے گئے۔

''اب نہ جانے کب کس کا بلاوا آجائے۔ مولا کی مرضی۔'' رفیقن بوا بڑے دل دوز لہجے میں کہتی، چپل سٹکاتی اندر داخل ہوئیں۔ ترکاری کا تھیلا لگ بھگ پٹخ کر تخت پر رکھا۔

''اے ہے بوا کون مرگیا؟ کس کی سناؤنی لے کر آئی ہو؟'' حکیم انوار کی اہلیہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''کوئی نہیں مرا ہے بیگم ساب۔ شیخ طاہر علی بڑے دربار جارہے ہیں۔''

''کہاں؟ دلّی؟ لاٹ صاحب کے دربار؟ ایسے بھاگ موئے کے!'' حکیم صاحب کی والدہ نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔ (اہلیہ عموماً سخت تبصروں سے گریز کیا کرتی تھیں۔)

دراصل حکیم انوار کی والدہ کے دل میں نورجہاں کے لیے بڑی محبت اور ہمدردی تھی۔ وہ انھیں چچی کہا کرتی تھی اور ان کے سامنے ہمیشہ سر سے دوپٹہ اوڑھ کر رہتی تھی۔ کبھی جو ڈھلک

جائے۔ ایک بار شیخ طاہر علی حکیم صاحب کے پاس آئے تھے، ''نور جہاں آپ کے گھر آتی جاتی ہے۔ والدہ صاحبہ سے کہیے اسے سمجھائیں کہ اپنے ماں باپ کے پاس گاؤں چلی جائے۔''

''گاؤں میں اسے کام نہیں ملے گا۔ بچوں کی پڑھائی نہیں ہوسکے گی۔ آپ بچوں کو یہاں رکھیں گے یا وہاں ان سب کی کفالت کا ذمہ لیں گے؟''

''وہ ہمارا فرض نہیں ہے۔ بہو کے گھر والے کھاتے پیتے لوگ ہیں، مکان پر بھی اس کا حق بنتا ہے۔''

''اور آپ کے مکان پر؟'' حکیم صاحب بھی بحث پر اتر آئے تھے۔ آخر محلے داری تھی۔

''وہ ہمارا فرض نہیں ہے۔ اس کے گھر والے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ مائیکے کے مکان پر اس کا حق بھی بنتا ہے۔''

''دیکھئے قبلہ، شرع حدیث آپ بھی جانتے ہیں۔ ہمارا بیٹا فوت ہو چکا ہے۔ لڑکے محجوب ہوگئے۔ اب انھیں حق دیا تو دوسرے بیٹے راڑ مچائیں گے۔''

''تو بیٹوں کو سمجھانے کی بجائے آپ بیوہ بہو کو ہی سمجھانا چاہتے ہیں۔ سنیے طاہر علی صاحب انھوں نے قدرے توقف کیا۔'' طاہر علی جواب طلب نظروں سے دیکھتے رہے۔

''سنیے طاہر علی صاحب!'' انھوں نے دوبارہ کہا، ''اگر میں شاہ وقت ہوتا تو آپ کی شریف، خوددار اور محنتی بہو کو موتیوں میں تلوا دیتا۔ لیکن شاہ وقت تو کیا میں تو اس محلے کا زمین دار تک نہیں ہوں کہ اس سے کہوں کہ وہ چھوٹا سا کمرہ خالی کر کے چلی جائے جس پر اس کا پورا حق ہے۔ اب آپ اس موضوع پر دوبارہ گفتگو نہ کریں۔'' انھوں نے بڑی نرمی و آہستگی لیکن مضبوطی کے ساتھ ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

طاہر علی اس کے بعد تبھی آئے جب وہ شیخ طاہر علی سے حاجی طاہر علی ہوگئے تھے۔ حاجی ہوجانے کے بعد کسی کے لیے دل میں کدورت رکھنا مناسب نہ جان کر انھوں نے پورے کنبے کے لیے حج کے کھانے کا نیوتا دیا اور کھجوروں، آب زمزم و ایک عدد تسبیح کا تحفہ بھی پیش کیا۔ حکیم انوار نے تحفے قبول کر لیے لیکن دعوت قبول نہیں کی۔ اس قدر صاف گو بلکہ منھ پھٹ تھے کہ بہانہ بھی نہیں بنایا۔ صاف کہہ دیا میں اس طرح کی دعوتیں قبول نہیں کرتا جن کا کوئی معقول جواز موجود نہ ہو اور جو اسراف کے زمرے میں آتی ہوں۔

طاہر علی اب حج کرنے کے بعد دل میں کدورت نہ رکھنے کا اصول بھول گئے۔ انھوں نے

محلے میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ حکیم انوار اپنے رشتے کے بھائی، جو عرف عام میں چچا بے دین کہلاتے تھے، کی طرح ہی دہریے ہو گئے ہیں۔ یہ دونوں حضرات جب مریں گے تو قبر انھیں باہر پھینک دے گی۔ (''جب ہم مر ہی جائیں گے تو قبر ہمیں رکھے یا پھینکے۔ حاجی طاہر علی کو قبر کے اندر کیڑے کھائیں یا ہمیں باہر بجو کتریں، کیا فرق پڑتا ہے۔'' چچا بے دین نے سنا تو قہقہہ لگا کر کہا۔ ''ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ڈر کر وصیت کر جائیں کہ ہمیں نذر آتش کر دیا جائے۔'')

اب بھائی ہم نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ جلے دل کے پھپھولے تو پھوڑیں گے ہی۔ حکیم انوار نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

''بھائی جان، اور اگر ہم اللہ میاں ہوتے تو ان کا حج لپیٹ کر ان کے منھ پر مار دیتے۔ ساحل پر پورٹر کو رشوت دے کر دو بھاری بھاری اسٹیل کے ٹرنک پار لگوائے ہیں۔ چینی ریشم کے تھان اور عمدہ مخمل، گھڑیاں اور جانے کیا کیا۔ دوکان پر الگ گوشہ بن رہا ہے۔ اس میں یہ سامان رکھا جائے گا۔''

''زیادہ کفر نہ بکا کرو۔'' حکیم انوار نے ڈانٹا۔ ''اور یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا؟''

''رفیقن بوا زندہ باد۔ آب زمزم اور کھجوروں کے لالچ میں حاجی صاحب کے یہاں جاتی رہتی ہیں۔ دعوت کے بعد زائد پلاؤ لے جا کر سکھائیں گی۔''

شوہر کے مرنے کے کوئی بیس برس بعد نور جہاں نے بھی بعارضہ ٹی۔بی انتقال کیا لیکن اس وقت تک اس کی بیٹی کی شادی ہو گئی تھی۔ اس نے ایف۔اے پاس کر کے پرائمری اسکول ٹیچر کی ٹریننگ لی تھی اور نوکری کر رہی تھی۔ مسلمان لڑکیوں کے تعلیم حاصل کر کے نوکری کرنے کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اور زیادہ تر یہ لڑکیاں ٹیچر کی ملازمت کو ترجیح دیتی تھیں کیوں کہ گھر والوں نے ابھی رسّی اتنی ہی ڈھیلی کی تھی۔ بڑا بیٹا بھی بی۔اے کرنے کے بعد (کہ اس وقت لوگ بڑے فخر کے ساتھ فلاں بی۔اے، فلاں ایم۔اے لکھا کرتے تھے اور اتنی تعلیم کو بہت جانتے تھے) کلکٹریٹ میں اپر ڈویژن کلرک ہو گیا تھا۔ دوسرے بیٹے نے علی گڑھ سے اردو میں ایم۔اے کیا تھا اور لکھنؤ میں ایک معروف اردو اخبار کے دفتر میں نوکری کر رہا تھا۔

حاجی طاہر علی حج سے اسمگل کر کے لائے ہوئے چینی ریشم و مخمل کے تھانوں اور گھڑیوں کے لیے دوکان میں الگ گوشہ بنا کر اپنا بزنس رفتہ رفتہ برتنوں سے کپڑوں میں منتقل کر لیا تھا اس لیے کہ اس میں منافع زیادہ تھا۔ بزنس کو کامیابی مل رہی تھی اس لیے گھر میں مزید خوش حالی آئی تھی۔ پوتوں

کو حصہ تو نہیں دیا لیکن وہ ان کا نام ان کی تعلیم کی وجہ سے فخر سے لیتے تھے۔ نور جہاں کی موت کے بعد چھوٹا بیٹا پاکستان چلا گیا۔ اخبار بند ہونے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا اور اردو میں ایم۔اے کی ڈگری لے کر اسے اپنا مستقبل یہاں بہت روشن نہیں نظر آرہا تھا۔ گرچہ ہندوستان میں ایک ٹھوس اور مضبوط مڈل کلاس کے ابھر کر سامنے آنے کی ابتدا ہو چکی تھی، شہر کی سڑکوں پر گاڑیاں دوڑنے لگی تھیں۔ لوگ شادی بیاہ ہوٹلوں یا شادی گھروں میں کرنے لگے تھے جنھوں نے انگریزی اسکولوں کے طرز پر کُکرمتوں کی طرح سر ابھارا تھا۔ سڑک کے بیچ اب شامیانے بہت کم تنا کرتے تھے لیکن خیر یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ نور جہاں بھولی بسری داستان تھی۔ ان تمام لوگوں کی طرح جو زندگی سے بساط بھر نبرد آزما ہوتے اور پھر رخصت ہو جاتے ہیں۔ حاجی طاہر علی کا دوسرا بیٹا سیاست میں آگیا تھا۔

رفیقن بوا

رفیقن بوا گھر پہنچیں تو جھلنگے پلنگ پر گری مڑی ہو کر لیٹی اماں نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''آئے گئی رفیقن۔''

''الو کی زبان لائے ہیں۔'' انھوں نے خوش ہو کر اعلان کیا۔ ''بھیا پکڑ کے لے آئے رہے۔''

''کا؟''

اماں کی آنکھوں کی طرح ان کا ذہن بھی دھندلایا ہوا تھا۔

''ارے روز دن لڑکن کو جموکا پکڑتا رہتا ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ زبان میں ہے۔ دیں گے تو لوگ اچھا پیسہ دے دیں گے۔''

''تمہارا لڑکا خصی کی کلیجی رکھ گیا ہے اور ایک کٹورا سالن۔''

''معلوم ہے۔'' رفیقن بوا نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔

''ملا روٹی ڈالنی ہوگی۔''

بوا کے تین بیٹوں میں سب سے چھوٹا پیدائشی اندھا تھا۔ منجھلا کھیت مزدور کا کام کرتا تھا لیکن اپنی مرضی سے شادی کرنے کے بعد الگ گھر میں رہنے لگا تھا۔ سب سے بڑا بیٹا جو بوا کا داہنا ہاتھ بن کر گھر سنبھال سکتا تھا، گاؤں میں چوری چکاری کرتا گھومتا پھرتا تھا۔ کبھی کسی کی مرغی چُرا لی، کبھی کسی کے کھیت سے کچھ اکھاڑ لیا۔ گنّے کاٹ کے لے آیا، باغ سے آم امرود جھاڑ لیے۔ جہاں پاتا وہاں پڑ رہتا۔ کئی کئی دن گھر نہ آتا۔ دو تین بار پٹ بھی چکا تھا لیکن بجائے سدھرنے کے اس کی حرکتیں

بڑھ گئی تھیں۔ آئے دن کی شکایتوں سے تنگ آکر بوا نے تقریباً قطع تعلق کرلیا تھا۔ صورت دیکھتیں اور گالیاں بکتیں۔ اس کا لایا ہوا سامان استعمال نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ آج بھی شہر سے واپس ہوتے ہوئے بوا گاؤں کی سرحدوں میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ لونڈا چھپا چھپ انھیں کی طرف چلا آرہا ہے۔ بوا نے دور ہی سے للکارا:

''ارے صورت حرام چوٹے۔ یہ اپنی میت لے کے کہاں سے چلا آرہا ہے۔''

''اماں کبھی تو اچھی بات بول دیا کرو۔ گھر پر ایک پیالہ خصی کا سالن رکھ آیا ہوں اور تھوڑی کلیجی۔ پاؤ آدھ سیر آٹا بھی ہے۔ روٹی ڈال لینا۔''

''کیکر جیب کاٹی رے داڑھی جار۔ کتنی بار کہا ہے ہم حرام نہیں کھاتے۔'' وہ چھنکیں۔

''قسم مولا علی کی کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ ہماری کمائی کا گوشت ہے، کھا لینا۔ اور اسے ضرور کھلا دینا بڑکی بڑھیا کو۔''

بوا نے ٹیڑھی ٹیڑھی آنکھوں سے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گئیں۔ کون سا کام کیا ہوگا اس نے؟ لیکن مولا علی کی قسم کھا رہا ہے۔ محرم میں علم اٹھاتا ہے، اتنا جھوٹ تو نہ بولے گا۔ کیا ہوگا کچھ۔

شاکر علی کو نانی سے بڑی محبت تھی۔ گوشت دراصل اماں اور اندھے بھائی سے زیادہ انھیں کی محبت میں دے گیا تھا۔ لیکن ایک جھاڑ وہاں بھی پڑ چکی تھی۔

''ارے کمینے، کہاں سے ٹھگ لایا؟''

''بکری چرا کے لایا تھا نانی مگر تم کھا لینا۔ آج مریں کل دوسرا دن۔ اماں تو مشکل سے آدھا پیٹ کھلا پاتی ہیں۔ منکر نکیر سے بھی جا کے لڑوگی۔ اس کے لیے طاقت چاہیے نا۔''

''کم بختی کے مارے دور ہو جا ورنہ یہیں سے پیچنک کے ماریں گے۔''

نانی کے پاس ایک مٹی کی ہنڈیا رکھی رہتی تھی جس میں وہ پچر پچر تھوکتی رہتی تھیں۔ رفیقن بوا اس میں بالو بھر کر رکھتی تھیں تاکہ صاف کرنے میں آسانی ہو۔ بڑھیا نے لرزتا کانپتا ہاتھ پلنگ کے نیچے کی طرف بڑھایا۔ لڑکا ہنسنے لگا۔ ان کانپتے ہاتھوں کی مار کتنی دور کی تھی، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ واپس ہونے کو مڑ گیا۔

''ارے عاقبت کی فکر کر۔ کیوں گناہ سمیٹتا ہے۔''

''تم ہو نا عاقبت کی فکر کرنے کو۔ جنت میں ہمیں نہ لے چلوگی کیا۔ جیسے انگلی پکڑ کے نوچندی جمعرات کے میلے میں لے جایا کرتی تھیں۔'' اس نے اتنی محبت سے، ایسے بھیگے ہوئے لہجے میں

کہا کہ چندھی آنکھوں سے جھر جھر آنسو جھڑنے لگے۔ زبان گرچہ پھر بھی تیزاب اگلتی رہی۔

''گل ڈے بورن، سدھر جا یا مر جا۔''

''ارے ہم نے محنت کر کے گوشت کمایا ہے۔'' وہ پلٹ کر مضبوط لیکن جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''ایک تمہیں بی بی رابعہ بصری بن کے نہیں پیدا ہوئی ہو۔ ہر وقت گالی، کوسنے۔''

گوشت واقعی اس نے محنت کر کے کمایا تھا۔ بلکہ محنت کے ساتھ خطرہ مول لے کر بھی۔

گاؤں میں دو راجپوت کنبوں میں، جو آپس میں پٹی دار تھے، عرصے سے رقابت چلی آتی تھی۔ ان میں سے ایک خاندان کے لڑکے نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ آگے شہر جا کر انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لینے کی بات تھی۔ گھر والے کہتے تھے لڑکا کچھ نہ بنا تو ڈپٹی کلکٹر تو بن ہی جائے گا۔ وجہ یہ تھی کہ ہائی اسکول میں اکثر لڑکے لڑھک جاتے تھے۔ اس زمانے میں نقل چوری کرنے اور نمبر بڑھوانے کا چلن عام نہیں تھا۔ یہ لڑکا محنتی تھا، پہلی بار میں پاس ہوا، وہ بھی ہائی اسکول سکنڈ کلاس لے کر۔ اس کا جشن منانے کے لیے گھر میں بڑا سا، تنومند بکرا لا کر باندھا گیا۔ پنڈت جی نے جشن کی جو مہورت نکالی وہ چار دن بعد کی تھی۔ پٹی داروں کو جلانے کے لیے خاص طور پر دعوت دی گئی تھی۔ ان کے یہاں کے ایک نوجوان لڑکے کو شرارت سوجھی۔ وہ جونیئر ہائی اسکول کا بھی امتحان پاس نہیں کر سکا تھا۔ کچھ ذاتی حسد کی آگ بھی تھی۔ شاکر علی کو بلا کے بولا:

''بکرا کھول کے لا سکتے ہو؟''

''کیا ملے گا؟'' جواب میں سوال کیا گیا۔

''پانچ روپے، ہانڈی بھرنے لائق گوشت اور ایک پسیری آٹا۔''

''گوشت دو کلو سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ آدھا کلیجی گردہ بھی۔ بکرا تندرست ہے۔''

''چلو، دیں گے، منظور۔''

''چلو لائیں گے، منظور۔''

''بکرا سفید ہے اور اس پر بڑے بڑے ہاتھوں کے گلابی چھاپے لگائے گئے ہیں۔''

شاکر علی ہنسے۔ ''دیکھا ہے۔ ٹھاکروں کا لونڈا اپنے ہاتھ سے پتے کھلا رہا تھا۔''

بکرا گھر کے پیچھے کیلے کے جھنڈ کے درمیان ایک کھونٹے سے باندھا گیا تھا۔ دو بجے رات کو جب گاؤں سن سن کر رہا تھا، بڑا خطرہ مول لے کے باڑھ پھلانگ کے کودے اور کسی طرح بکرا نکال لائے۔ لاتے ہی استرے سے اس کے سارے بال مونڈے اور 'کلائنٹ' کو پہنچا دیا۔ پوچھنے

پہلے، جس وقت گاؤں کے بیش تر لوگ 'میدان' گئے ہوئے ہوتے تھے، آموں کے جھرمٹ میں بکرا ذبح ہوگیا۔ اب جو بھی ہنگامہ ہونا تھا، ہوا لیکن شاکر علی کو ان کا محنتانہ نہایت ایمان داری سے ادا کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے اسے اپنی محنت کی کمائی ٹھہرایا۔ ان کا ارادہ خود تو بکرا چرانے کا تھا نہیں، نہ ہی وہ اسے اکیلے ہضم کر پاتے۔ مرغیاں بے خطر چُرا لیا کرتے تھے۔ اکثر الزام لومڑیوں اور سیاروں کے سر جاتا۔ ویسے دھیرے دھیرے لوگ ان کی حرکتوں سے بھی واقف ہو رہے تھے۔ رفیقن بوا تو اچھی طرح جانتی تھیں۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے کہیں محنت مزدوری کر کے حق حلال کی لے آتا تو اسے بھی مشکوک نظروں سے دیکھتیں۔ کھانے کی چیزیں کھانے سے صفا انکار کر دیتیں۔ ماں کو بھی نہ کھانے دیتیں۔ ایک دن نہایت سنجیدگی سے بولا، اماں، تم بڑی پارسا بنتی ہو، نہ کھاؤ۔ نانی کو کھانے دیا کرو۔ آخری وقت ہے۔ کچھ اچھا کھا لیتی ہیں تو ہمارا جی خوش ہو جاتا ہے۔ اس دن رفیقن بوا کے دل میں بھی کہیں کچھ بہنے لگا تھا۔ وہ دودھ تھا یا خون مگر کچھ تھا گیلا گیلا سا جو آنکھوں تک آ رہا تھا۔ خاموشی سے اس دن اس کے لائے دودھ کا پیالہ انھوں نے اماں کے منھ سے لگا دیا تھا اور اماں سے کہا تھا کہ رام بچن اہیر کی گیا نے بچھیا بیائی تھی، اس نے خوشی میں پاؤ بھر دودھ اماں کو بھیجا تھا۔ اس کے بعد سے وہ جو لاتا بغیر گالی کوسنے اماں کو کھلا دیا کرتیں۔ کبھی یقین ہو جاتا کہ اپنے ہاتھ پیر چلا کر لایا ہے تو خود بھی کھا لیتیں۔ کچھ عرصے سے منجھلا بیٹا اندھے بھائی کو اپنے یہاں لے گیا تھا۔ بھاوج ٹھیک سے کھانا دیتی ہوگی یا نہیں یہ سوچ کر اپنے کھانے سے کچھ بچا کر کبھی اس کو کھلا آتی تھیں۔

عرصہ گزرا، رفیقن بوا، جن کا نام والدین کے یہاں رفیق النساء رکھا گیا تھا، رفیقن کہلاتی تھیں۔ ان کے نام میں 'بوا' کا لاحقہ شامل نہیں ہوا تھا۔ شادی کے بعد فلانے کی بی بی اور شاکر علی کی پیدائش کے بعد کہ پہلوٹھی کے تھے، شاکر کی اماں کہلانے لگی تھیں۔ 'فلانے' جن کی وہ اہلیہ تھیں، دوسری جنگ عظیم میں کیمپ فالورز (Camp followers) میں بھرتی ہوئے تھے۔ افواج کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومتے پھرے۔ گاؤں میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ حولدار صاحب کہلانے لگے تھے۔ ان کی وجہ سے ان کے رشتے داروں کی بھی عزت افزائی ہوئی تھی۔ سب کے سب مفلوک الحال تو نہیں لیکن غریب ہی تھے۔ بیش تر گھروں میں پھوس کی چھتیں تھیں۔ رفیقن بوا نے کھپریل ڈلوالی تھی اور اعلان کرتی تھیں کہ جلد ہی ان کا گھر پختہ ہو جائے گا۔ ان کے گھر اوولٹین اور پولسن کے ڈبے آیا کرتے تھے۔ مزے مزے کے جام، جیلی اور ڈبہ بند مچھلیاں (جو سخت بدبو کی وجہ سے یا تو پھینک

دی جاتیں یا پھیکو چمار کی بیوی اٹھا لے جاتی)۔ یہ ایسی نعمتیں تھیں جنھیں دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ کچھ فیاضی اور کچھ 'شو آف' کے تحت ان میں کبھی کبھی تھوڑی مقدار میں قریبی رشتے داروں کا بھی حصہ لگتا تھا۔

پھر ایک دن جنگ ختم ہوگئی۔ ہندوستان کے ڈھائی ملین جاں باز سپاہی انگریز بہادر کی حمایت میں ساری دنیا کے جنگی تھیٹروں میں لڑے اور اسی تناسب سے کھیت بھی رہے تھے، لنگڑے لولے ہوئے تھے، دماغی توازن کھویا تھا جب کہ ان میں سے زیادہ تر کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جس دشمن سے وہ لڑ رہے ہیں اس سے ان کی دشمنی کیا ہے اور کیوں ہے۔ جبری بھرتی کی نوبت نہیں آئی تھی پھر بھی اور کانگریس کے جنگ مخالف رویے کے باوجود ہندوستان نے صنعتی، معاشی، نفری، جذباتی اور سماجی ہر اعتبار سے انگریز حکومت کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو فوجیوں کی بڑی تعداد دفعتاً بیکار ہوگئی۔ رفیقن کے میاں بھی گھر آگئے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ جنگجو سپاہی (active combatant) نہ ہونے کے باوجود ایک پوری ٹانگ سے محروم ہو کر آئے تھے۔ ان چھوٹے موٹے اہل کاروں کے لیے نہ کوئی معاوضہ تھا نہ پنشن، بس بڑے بڑے تھیلے بھر کر وہ ڈبے اور پیکٹ ایک آخری مرتبہ ان کے ساتھ آگئے تھے۔ اس مرتبہ یہ نعمتیں نہ کسی کو دی گئیں نہ کھائی گئیں۔ انھیں گھر کے باہر ایک بوریا بچھا کر اونے پونے داموں میں بیچ دیا گیا۔ آخر میں حولدار صاحب کی یونیفارم، گرم کوٹ اور برما کے جنگلوں میں پہنے گئے فل بوٹ بھی بیچ دیے گئے۔ بہ وقت تمام انھیں گاؤں میں ایک آٹا چکی پر گیہوں تولنے کا کام ملا۔ بیساکھی بغل میں رکھ لیتے اور ایک بھدی سی، گاؤں کے بڑھئی کی ٹھوکی ہوئی، اپنی جیسی ٹوٹی ٹانگ والی کرسی پر بیٹھ جاتے، جھک جھک کر گیہوں کے تھیلے اٹھاتے اور ترازو پر رکھ کر وزن بولتے جاتے۔

وہ بہت خاموش رہا کرتے تھے۔ اکثر چہرے پر ایک کرب ناک کیفیت طاری ہوجاتی۔ اب اللہ جانے ٹانگ میں درد ہوتا تھا یا دل میں۔ آنکھیں جو کچھ دیکھ کر آئی تھیں اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان کا معمولی پڑھا لکھا، سادہ، تقریباً احمق ذہن سوال کرتا تھا کہ انسانوں نے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اتنی بے رحمی اور سفاکی سے کیوں تباہ کیا۔ اور یہ کہ خدا کس کو سزا دے رہا تھا، اتحادیوں کو یا نازیوں کو یا ان بے گناہ شہریوں کو جو جنگ میں شامل بھی نہیں تھے۔ خدا کہاں ہے؟ مولوی صاحب وعظ میں بتاتے تھے کہ خدا عرش بریں پر ہے تو میں عرش بریں تک کیسے پہنچوں، اپنی فریاد لے کر اس تک کیسے جاؤں۔

سوالوں کے جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے انھوں نے چکی پر جانا چھوڑ دیا۔ گھر کے اوسارے میں کھپریل تلے بیٹھے خلا میں گھورتے رہتے۔ کبھی کبھار کچھ بُدبداتے، کبھی انگلیوں سے ہوا میں نقشے بناتے۔ لوگوں نے کہا ان پر جنگ میں مرنے والے کسی انگریز کی روح آ گئی ہے اس لیے کہ کبھی کبھی ان کی بدبداہٹ اوٹ پٹانگ انگریزی میں بھی ہوا کرتی تھی۔ لوگ اس سے بڑا رعب کھاتے۔ رعب تو لوگ ان کہانیوں سے بھی کھایا کرتے تھے جو حولدار صاحب کبھی کبھار 'خوش مزاجی' کا دورہ پڑنے پر سنایا کرتے تھے۔ ان میں ایک کہانی اس خبیث روح کی بھی تھی جس سے ان کا سابقہ برما کے جنگلوں میں پڑا تھا (کہاں کہاں ہو آئے تھے حولدار صاحب۔ برما، عراق، مصر۔ ایسی ایسی جگہیں جن کا لوگوں نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ اگر کسی نے سنا بھی تھا تو کسی ناقابل یقین جن بھوتوں کے دیس کے طور پر۔ اب کون رہے گا ایسی ایسی جگہوں میں)

تب وہ اپنی فوج کی ٹکڑی سے الگ ہو گئے تھے۔ ایک درخت سے اس امید میں ٹکے بیٹھے تھے کہ شاید کوئی انھیں ڈھونڈ نکالے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ اچانک درخت کے اوپر سے کچھ انگارے ٹپکے۔ انھوں نے سر اٹھایا تو ایک نہایت بھیانک چہرے نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اس اندھیرے میں وہ انگارے کچھ زیادہ ہی روشن تھے۔ ہڈیوں سے چپکی کھال کے درمیان دو ترچھی آنکھیں جن میں زردی کھنڈی ہوئی تھی، بھی کچھ زیادہ روشن لگ رہی تھیں۔ بلکہ ان میں ایک آگ دہک رہی تھی۔ غصے اور نفرت کی آگ۔ حولدار صاحب نہایت پختہ پختہ عقیدے والے مسلمان تھے۔ انھوں نے ایک ہاتھ اپنی بندوق پر رکھا اور ساتھ ہی زور زور سے درود شریف پڑھنا شروع کیا۔ صورت غائب ہو گئی لیکن چند لمحوں بعد دیکھا تو وہ صورت اتر کر ٹھیک ان کی بغل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بالکل ایسی جیسے کسی مردے میں کس سحر کے زیر اثر روح واپس آ گئی ہو لیکن گوشت و پوست نہیں۔ یک لخت اس نے اپنے خشک، پنجوں جیسے ہاتھوں سے چشم زدن میں ان کی کمر سے لٹکا تھیلا کھینچا اور اسی تیزی سے کہ جس سے تھیلا کھینچا تھا، درختوں کے درمیان گم ہو گئی۔ درود شریف کا وِرد بھول کر حولدار صاحب پتے کی طرح کانپنے لگے۔ گرچہ وہ خندقیں کھودنے اور جنگی سامان و رسد سنبھالنے کی ڈیوٹی پر مامور تھے تاہم اس طرح کے سارے عملے کو ہتھیار چلانے کی تھوڑی سی تربیت لازمی طور پر دی گئی تھی لیکن یہ تربیت انسانوں سے اپنا تحفظ کرنے کے لیے تھی، بدروحوں سے نہیں بلکہ برما کے جنگلوں میں ایسی بے شمار بدروحیں بھٹک رہی تھیں جو لوگوں کے تھیلے کھینچ کر بھاگیں تھیلے میں کچھ خشک ڈبل روٹی کے ٹکڑے تھے اور ایک بڑی بوتل پانی۔ یہ زادِ راہ

انھیں تین چار دن زندہ رکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد ان کی صورت حیرت انگیز طور پر اسی خبیث روح جیسی ہوتی جاتی اور اگر وہ کسی کے زادراہ کا تھیلا نہ کھینچ پاتے تو بغیر توپ کے گولوں، بندوق کی گولیوں یا سنگین وار کے مرجاتے۔ ان کی زندگی باقی تھی کہ دوسرے ہی دن ان کے کچھ ہم راہیوں نے انھیں ڈھونڈ نکالا۔

''ہم بچ گئے۔ اس لیے کہ ہم نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ نہ ہی اپنی بندوق چھپائی۔'' کہانی کا اختتام اس طرح ہوا کرتا تھا۔

پلٹ کر دیکھ لیتے تو؟ کسی نے ایک بار پوچھا تھا۔

''تو ہم پتھر کے ہو گئے ہوتے۔ ہمارے جو ساتھی ہم تک پہنچتے، ہمیں چھو کر وہ بھی پتھر کے ہو جاتے۔''

پتھر کے تو وہ پھر بھی ہو گئے تھے۔

رفیقن بوا نے مولی ساب سے گنڈے تعویذ کرائے۔ وہ بے چارے کوئی پیسہ نہیں لیتے تھے۔ کہتے تھے اللہ کا کلام ہے۔ جس دن میں نے اس کے ذریعے علاج کرنے کا پیسہ لینا شروع کیا، اللہ میرے ہاتھ سے شفا چھین لے گا۔ لیکن مولی ساب کے پیسہ نہ لینے کے باوجود رفیقن بوا کے میاں کو شفا نہیں ہوئی۔ کچھ لوگوں کے کہنے پر انھوں نے اوجھا سے جھڑوایا بھی گرچہ ان کی اماں کہتی رہیں کہ دیوی دیوتاؤں کو درمیان میں ڈالنے سے کفر کا گناہ ہوگا۔ حولدار صاحب پر جو یوروپین بھوت تھا وہ نہ مولی ساب سے سنبھلا نہ پنڈت جی سے (یوروپین بھوت ویسے بھی کسی سے نہیں سنبھلتے)۔ وہ ویسے ہی مجہول بنے رہے۔ پھر انھوں نے کوئی کام بھی نہ کر کے دیا جب کہ چکی چھوڑنے کے بعد پٹواری جی نے اپنے یہاں کچھ کھاتے دیکھنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ ان کی ذہنی کیفیت بد سے بدتر ہوتی گئی اور وہ زیادہ دن زندہ بھی نہیں رہے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی اس کے ہولناک اثرات دنیا پر اپنا پرتو ڈالتے رہ رہے تھے۔ جو لوگ زندہ واپس آنے کے بعد بھی اسی طرح گھر میں بیٹھے بیٹھے ناکارہ ہوئے یا بے وقت مرے یا جن کی اگلی نسلیں تباہ ہوئیں ان کا تو کہیں نہ ریکارڈ ہے نہ اندازے۔ اگر اس طرح کی موتوں اور ذہنی امراض کے اعداد وشمار کسی نے اکٹھے کیے ہوتے تو رفیقن کے شوہر نے ان کے وسیع وعریض رجسٹر میں کہیں ایک نقطے کا اضافہ ضرور کیا ہوتا۔

ان کی موت نے کچھ ہی عرصے میں رفیقن کو رفیقن بوا بنا دیا اور لڑکوں کو بے نتھا بیل۔

اس وقت انھوں نے گوشت اسی بے نتھے بیل کی حق حلال کی کمائی سمجھ کر جلدی جلدی آٹا گوندھ کر روٹی پکائی۔ دھوئیں سے آنکھیں کڑوانے لگی تھیں۔ آنکھیں پونچھ کر اماں کو گوشت روٹی کھلانے بیٹھ گئیں گرچہ ان کے اپنے پیٹ میں بھوک کسی بچھو کی طرح ڈنک مار رہی تھی لیکن جب تک اماں نے 'بس' کہہ کر ان کا ہاتھ پرے نہ ڈھکیلا، انھوں نے منھ میں لقمہ نہ ڈالا۔

اماں آج کچھ زیادہ کھا گئی ہیں۔ کتنے دن بعد اتنے عمدہ گوشت کا سالن نصیب ہوا ہے۔ کہیں پیٹ نہ خراب ہوجائے۔ ''اماں، قُل ھواللہ پڑھ کر اپنے اوپر پھونک لو۔'' انھوں نے کہا اور بسم اللہ کہہ کر المیونیم کی اسی رکابی میں اپنے لیے بھی کھانا لے کر بڑے بڑے لقمے توڑنے لگیں۔ سالن انھوں نے کم سے کم لگایا اور بچا ہوا اٹھا کر چھینکے پر رکھ دیا کہ اماں کو بعد میں پھر کھلا دیں گی۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو کبھی کبھار بھیا کے یہاں، کبھی ماشٹر رمضان کے یہاں کچھ اچھا کھا لیتے ہیں۔ نیلے کا گوشت بھی مل جاتا ہے لیکن خصی کا گوشت وہ بھی تیار۔ کیا بات ہے۔ پتہ نہیں کبھی مولی ساب نے ذکر کیوں نہیں کیا کہ جنت میں قلعی کیے گئے تانبے کے دیغ میں پکا بکرے کا سالن اور خمیری روٹیاں بھی کھانے کو ملیں گی یا نہیں۔ وہ دیر تک سوچتی رہیں اور یہ بھی کہ حج کر پاتیں تو جنت میں جانے کے لیے دروازے کھل گئے ہوتے۔ حولدار صاحب زندہ رہ جاتے تو دونوں میاں بی بی کبھی نہ کبھی حج کو ہوآتے۔ یا یہ حرامی ذرا معقول نکلا ہوتا، ماں کے ہاتھ یہ کچھ حق حلال کی کمائی رکھتا۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس لی، اللہ مالک ہے۔ اس کی مرضی میں ہم بندوں کا کیا دخل۔

اور واقعی اللہ کی مرضی ہی تو تھی یہ لڑکا وارڈ کاؤنسلر کا الیکشن جیت گیا۔

ڈاکٹر فاطمہ حسن

مکر کرنے والے

''وہ لڑکوں اور بچیوں کے ساتھ پُرتشدد زیادتیوں کی تصویریں بناتے، فلمیں بناتے اور دنیا کی منڈی میں فروخت کر دیتے۔ وہ بارسوخ لوگ تھے۔ اُنھیں نہ پکڑا جاتا تھا، نہ سزا ہوتی تھی۔ بچیوں کی لاشیں ملنا تو عام سی بات تھی۔ گود کے بچے بھی محفوظ نہ تھے۔''

''پھر؟''

دادی سے اُس پوتی نے پوچھا جو چند روز پہلے گھر لوٹی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی میں شہر ایک عذاب سے دوچار ہوگیا تھا۔ ایسی وبا پھیلی تھی کہ نفسا نفسی کا عالم سمجھ میں آ گیا تھا۔ صرف یہ شہر ہی نہیں، پورا ملک بلکہ ساری دنیا اس لاعلاج بیماری کی لپیٹ میں آ گئی تھی جو ایک جراثیم سے پھیل رہی تھی جس سے بچنا بس یوں ہی ممکن تھا کہ ہر آدمی دوسرے سے دور ہو جائے۔

''جب بھائی بھائی سے اور ماں بچوں سے جدا کر دی جائے تو اور نفسا نفسی کیا ہوگی۔'' دادی کہہ رہی تھیں۔ ''بس یہ سب اُن جیسے لوگوں کے کرتوت کی سزا تھی جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے بھی عذاب اتارا تھا۔''

''دادی کون لوگ؟'' پوتی نے پھر سوال کیا۔

''ارے وہی قومِ لوط۔ جب اُنھوں نے مکر کیا تھا، لڑکوں کے گھر شب خون مارنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے تو اللہ نے پوری بستی کو تباہ کر دیا۔''

''تو دادی آپ کے خیال میں یہ اللہ کا عذاب ہے؟''

''نہیں بیٹی! یہ اللہ کی تدبیر ہے، وہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اب دیکھ لو ہر طرف جنگ، تباہی، قحط، ظلم...... جنگ کو جنگ سے تو نہیں روکا جاسکتا۔ افلاس اور امراض، اسلحے اور تعیش کے سامان سے تو ختم نہیں کیے جاسکتے۔ دنیا میں قحط اور جنگ بڑھائی جا رہی تھی، روکنے کی تدبیر کوئی نہیں کر رہا تھا۔ پھر بہترین تدبیر کرنے والے نے کیسے سب کچھ روک دیا۔'' دادی کہہ رہی تھیں۔

دادی پوتی اپنی گفتگو میں محو تھیں اور میں سوچ رہی تھی، واقعی جب خیر اور شر کا توازن ہی

الٹ جائے تو قدرت اس توازن کو واپس لانے کے لیے کوئی تدبیر تو ضرور کرتی ہے۔ سارا حسن فطرت اسی توازن کے لیے تو ہے اور اس حسن کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ مجھے میری امریکن سہیلی یاد آئی۔ وہ کسی بھی مصلحت و منافقت سے بالاتر ہو کر سچ بولتی تھی اور اُس کی یہی خوبی ہماری دوستی کی بنیاد بن گئی۔

ایک دن جب ہم نیویارک میں تھے، اُس نے کہا، ''یہاں تمھیں بہت سے پاگل نظر آئیں گے، سڑک پر چلتے ہوئے، عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، ڈرنا مت۔''

میں نے کہا، ''ہاں! میں اُنھیں شراب کی نشے میں سمجھتی رہتی ہوں۔''

''نہیں، یہ ذہنی مریض ہیں، اس شہر میں مناظرِ فطرت کو ختم کر کے کنکریٹ کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی کردی گئی ہیں۔ ایک جنگل بنا دیا گیا ہے کنکریٹ کا۔ آسمان تک نظر نہیں آتا۔ فطرت سے دور ہو کر لوگ ذہنی مریض بنتے جا رہے ہیں۔''

تب سے میں نے وہاں کے لوگوں کی حرکات وسکنات کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو مجھے اُن کے کھانے پینے کا انداز عجیب لگا۔ چلتے پھرتے، بڑے بڑے لفافے اور گلاس ہاتھ میں لیے مسلسل کھاتے، اتنے زیادہ موٹے موٹے لوگ امریکا میں اکٹھے نظر آتے کہ غیر فطری لگتے۔ میرا خیال ہے ان کا زیادہ کھانا بھی پاگل پن کی علامت ہے۔ میں نے اپنی پاکستانی سہیلی کو بتایا تھا۔ اُن کے اسٹور میں کھانے پینے کا بے تحاشا سامان ہوتا، اور ہمیشہ آفر لگی ہوتی اور یوں سستا دیکھ کر لوگ خوامخواہ خریدتے۔

میری سہیلی نے کہا، ''افریقا میں لوگ بھوک کی وجہ سے مر رہے ہیں اور امریکا میں لوگ زیادہ کھا رہے ہیں۔ کہیں یہ اُن کے حصہ کا کھانا تو نہیں کھا جاتے؟ دوسرے ملک کو جنگ اور قحط میں دھکیل کر عیش کر رہے ہیں۔''

''دادی! دنیا کے سب سے ایڈوانس شہر میں کھانے پینے کا سامان نہیں مل رہا۔ اسٹور خالی پڑے ہیں، میں تو شکر ہے کہ یہاں آگئی۔'' میری بیٹی کہہ رہی تھی۔

''ہاں بیٹی! سب کے دن یکساں نہیں رہتے۔ ہمیں تو یہی بتایا گیا ہے کہ جو کچھ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے، وہ کسی اور کے حصے کا ہے، ہمیں دیکھنا چاہیے، ہمارے گرد ضرورت مند کون ہے۔''

''اب وہ کیسے گزارا کر رہے ہوں گے جو ہر وقت کھاتے رہتے تھے؟''

''کہاں بیٹی، تم نے کہاں دیکھا؟''

''وہیں دادی، فاسٹ فوڈ کی دکانوں کے آس پاس، سڑکوں پر، چلتے پھرتے، بسوں اور ٹرام پر۔ ہر جگہ، کچھ نہ کچھ کھاتے ہوئے لوگ۔ آپ تو ہمیں کہتی تھیں کہ چلتے پھرتے نہیں کھانا چاہیے۔''

میں دادی پوتی کو مکالمہ کرتے سنتی ہوں۔ یہ دو نسلیں ہیں۔ دو نہیں، میری بیٹی تو تیسری نسل ہے، بیچ میں، میں معلق ہوں۔ کچھ مذہب کی مانتی ہوں، کچھ سائنس کی۔ میرے دوست روشن خیال ذہین لوگ، منطق کی دلیل ماننے والے اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے والے، وہ انسانی مساوات پر یقین رکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ معاشی ناہمواری، بھوک، افلاس، کیپٹل سسٹم کا مسلط کردہ کارپوریٹ نظام کا عذاب ہے جو سامراجی قوتوں نے پیدا کیا ہے۔ ان بے لگام قوتوں کے عفریت سے پیچھا چھڑائے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ مگر اس عفریت کو قابو میں کیسے کیا جائے؟

''ہاں تو بیٹی، اُس تدبیر کرنے والے نے ہمیں موقع دیا ہے، ابھی بھی کچھ مہلت ہے، توبہ کریں، استغفار کریں، اپنی حرص و ہوس کو چھوڑ کر نیک انسان بنیں، بس انسانوں کی خیر چاہیں۔''

میں سوچتی ہوں، یہ خیر تو سبھی چاہتے ہیں مگر تدبیر کسی اور قوت کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فاطمہ حسن

کہانی ایک سفر کی

"میں تم لوگوں سے الگ ہو رہی ہوں" اس نے کہا اور وہیں ٹھہر گئی جہاں وہ لوگ پہنچے تھے۔ ان میں دو عورتیں تھیں اور دو مرد۔ رُک جانے والی عورت "ب" نے کہا "مجھے میرا تجربہ بتا رہا ہے کہ ہم غلط سمت میں چل رہے ہیں۔ اس سفر کا حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اس طرح بھٹکتے رہنے سے بہتر ہے کہ ایک مرتبہ اس نقشے پر نظر ڈال لیں جو ہمارے بزرگوں نے بنائے تھے۔ صحیح سمت کی نشاندہی اسی سے ہو جائے گی اور ہمیں اپنے قدموں کو بھی تیز کرنا ہوگا کہ ہم نے کافی وقت بھٹکنے میں گزار دیا ہے۔ وہ نقشہ بڑی حد تک میرے ذہن میں محفوظ ہے تم لوگ چاہو تو میں اسے کاغذ پر کھینچ دوں۔"

"تمہارے ذہن میں محفوظ ہے" "ج" طنزیہ مسکرایا۔ اور "الف" کی طرف دیکھا۔ ذہن میں تو میرے بھی کئی نقشے ہیں مگر راستہ جو سامنے نظر آرہا ہے وہ زیادہ واضح ہے اور وہ بزرگ ۔۔؟ وہ تو اپنا سفر تمام کر گئے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ انہوں نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی۔ یہ "ب" اگر ہمیں اسی سمت لے جا رہی ہے جو پیچھے رہ گئی ہے تو بہتر ہے کہ ہم اسی جگہ بیٹھ جائیں جہاں تک پہنچے ہیں۔

"الف" نے "ج" کی باتوں سے جزوی اتفاق کیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو راہ بھی نظر آئے اس پر چلتے رہنا چاہئے بیٹھ جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ سمت کی نشاندہی بھی ابھی ہمیں خود کرنی ہے۔ اُس نے "د" سے تائید چاہی۔

"د" عورت ہے اس کی دانش درست نشاندہی کر دے گی۔ "ب" نے اس توقع کے ساتھ "د" کی طرف دیکھا مگر وہ خاموش تھی۔ ایسی خاموشی جسے با آسانی تائید سمجھا جائے۔ "ب" کو اس کی خاموشی نے مضطرب کر دیا یہ جانتی ہے کہ "الف" اور "ج" غلط سمت میں ہیں۔ پھر یہ کیوں نہیں بولتی "ب" نے سوچا اور "د" کو یہ کہتے ہوئے سنا "میں آپ کے ساتھ ہوں سمت کا تعین آپ خود کر لیں"۔ "ب" کی حیرت اب خوف میں ڈھل گئی اس نے ان تینوں سے علیحدگی کو ہی مناسب جانا اور کہہ دیا کہ وہ ان کے ہمراہ نہیں چل سکتی۔

"الف" نے "ج" اور "د" کی طرف دیکھا "ج" کے ہونٹوں پر وہی طنزیہ مسکراہٹ تھی اور "د" نظریں چرا رہی تھی۔ "ب" نے ان تینوں کو خدا حافظ کہا اور تیز قدموں سے ان سے دور ہوگئی۔ "ب" نے تنہائی میں ہی عافیت جانی اور کچھ عرصہ سوچ بچار کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ سفر کا دوبارہ آغاز تو کبھی بھی کیا جاسکتا ہے۔ بھٹکتے ہوئے منزل سے دور ہوجانے سے بہتر تو گوشہ نشینی ہی ہے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ اُن لوگوں سے جدا ہونے سے پہلے وہ "الف" کو غلط سمت میں بڑھ کر وقت ضائع کرنے سے روکنا چاہتی تھی۔ مگر "ج" اس کی بات کاٹ دیتا اور "د" بھی "ج" کی تائید میں خاموش ہوجاتی۔ "ب" نے اپنی گوشہ نشینی کے دوران سوچ بچار میں کچھ وقت گزارا۔ ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں اٹھتا تو کیا ہمارے بعد والے بھی بھٹکتے رہیں گے۔ جس راستے پر یہ تینوں جارہے ہیں وہ یقینا منزل کا نہیں۔ میرا رک جانا پیچھے آنے والوں کے لئے غلط تقلید کی وجہ نہ بن جائے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وہ سوچتی رہی اور کئی دن گزر گئے۔ ایک دن اُس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ کئی نوجوان کھڑے تھے۔ آپ یہاں گوشے میں بیٹھی ہیں ہم آپ کو تلاش کر رہے تھے۔

تلاش مگر کیوں؟ "ب" نے سوال کیا۔

"گزشتہ برس جب آپ ہمارے درمیان تھیں ہم نے آپ سے جو سیکھا تھا وہ اب تک ہمارے کام آرہا ہے مگر اب کچھ اور سوالات ہمارے ذہنوں میں ابھر رہے ہیں اور جواب دینے والا کوئی نہیں۔ براہ کرم ہماری رہنمائی کیجیے۔ ہمیں علم کا دروازہ بند نظر آرہا ہے اور یہاں سے راستے بھی معدوم ہوگئے ہیں۔ ہم کب تک وہاں ٹھہرے رہیں جہاں صرف لاحاصلی ہے"۔

"ب" نے بہت عرصے سے گفتگو نہیں کی تھی جس خاموشی کی اُس نے ٹھانی ہوئی تھی اب اسے توڑنا محال محسوس ہورہا تھا۔ نوجوانوں میں اضطراب تھا اُن کی حالت ویسی ہی تھی جس میں وہ اپنے تینوں ساتھیوں سے جدا ہوئی تھی۔

تو کیا ایک اور سفر کے لئے سازگار وقت آگیا ہے۔ میں سمت کی نشاندہی کردوں تو یہ نوجوان منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اُس نے نوجوانوں سے کہا وہ چند روز بعد آئیں میں ایک نقشہ بنا دوں گی جو سفر کے مرحلوں کی نشاندہی کرے گا۔ قدم کی رفتار کا تعین بھی کردوں گی تاکہ آہستہ آہستہ یا تیز روی میں ساتھیوں سے بچھڑ نہ جاؤ۔

ایک تنہا دن

میرے پاس اپنے لیے کبھی وقت نہیں ہوتا۔ عورتوں کے پاس عموماً نہیں ہوتا لیکن میری بیٹی
آٹسٹک (autistic) ہے۔ یہ دنیا اس کے لیے ایک معمہ ہے اور وہ دنیا کے لیے۔ ننو اس معمے کے
ٹکڑے جوڑ کر اپنے ذہن میں اس کی تصویر بنانے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن اس کی استانیاں
اسے دو اور دو چار سکھانے، اور تمیز سے بات کرنا سکھاتی رہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان صلاحیتوں
سے وہ اور اس کی کلاس کے دوسرے بچے اس دنیا میں گزارا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان
بچوں کو میرے جیسے لوگ، ننو کے جیسا سمجھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے جیسا نہیں ہے۔
میں تو صرف اپنی بیٹی کو جانتی ہوں لیکن مجھے شبہ ہے کہ شاید اس کی کلاس کا کوئی بھی بچہ دوسرے کی
طرح نہیں ہے لیکن میں انھیں اتنا نہیں جانتی کہ وثوق سے کہہ سکوں۔

اتنی مشکل سے اس اسکول میں جگہ ملی تھی اور شروع میں ننو وہاں جانے سے انکار کرتی تھی
مجھ سے لپٹ جاتی تھی اور واپسی پر مجھ سے خفا رہتی تھی چیختی تھی، مجھے مارنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس
کے لیے کوئی بھی نیا تجربہ برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے اندازہ ہوا کہ میں
اسے چھوڑ نہیں رہی ہوں، اپنی ذمہ داری سے دستبردار نہیں ہوئی ہوں۔ اب میں اپنے کام سے
واپسی میں اسے اسکول سے اٹھاتی ہوں اور وہاں سے میرا دوسرا کام، بلکہ میرا اصلی کام شروع ہوتا
ہے، ننو کو اس دنیا کے جگ سا پزل (jigsaw puzzle) کے وہ ٹکڑے تھمانا جو آج کے دن کے
تجربے کو سمجھنے کے لیے اسے چاہییں۔

ننو کا نام نصرت ہے لیکن زندگی کے سارے کاموں کی طرح بولنا بھی اس لیے دشوار
تھا۔ جب اس نے اپنے لیے ننو کا لفظ استعمال کیا تو اس کا باپ اور میں دونوں خوش ہو گئے تھے لیکن
اس کا باپ ان چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے خوش نہیں رہ سکا ہماری زندگی سے نکل گیا۔ ننو نے اپنی
بےزبانی میں اس کو بہت یاد کیا پھر شاید بھول گئی۔

ننو جس طرح بولتی تھی میں ہی سمجھ سکتی تھی۔ کچھ لفظ کچھ اشارے۔ وہ سوال کرتی تھی، زمین

اور آسمان کے، پانی اور ہوا کے۔ اس کے خیال اڑتے تھے، ایک لمحہ وہ آسمان کے پرندوں کی بات کرتی، دوسرے میں میز پر رینگتی چیونٹیوں کی۔ درخت سے لٹکی پلاسٹک کی کالی تھیلیاں، کوڑا کریدتے بچے، اس کی نگاہ سے کچھ بھی نہیں بچتا تھا لیکن وہ ہر چیز کو ایسے دیکھتی تھی جیسے وہ اس کرہ کی باسی نہ ہو، کہیں مریخ سے آئی ہو۔ میں جواب دیتے دیتے تھک جاتی لیکن وہ جو سوال کرتے نہ تھکتی تھی گاڑیوں کے ہارن سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی تھی۔

اب میں اکیلی بیٹھی تھی۔ مجھ سے صرف میرا اپنا ذہن سوال کر رہا تھا اور میں ہی بغیر زبان ہلائے جواب دے رہی تھی۔

چند ہی دن پہلے یہ افواہ اڑی تھی کہ ایک وبا پھیل رہی ہے۔ پھر خبر آئی کہ سینکڑوں لوگ نشانہ بن چکے ہیں اور ان میں سے بیسیوں لقمۂ اجل ہو چکے ہیں۔ سب پر ایک دہشت چھا گئی۔ وبا کیسے پھیل رہی ہے؟ اس سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

بعض نتھنے پھلا کر ہوا میں اس کی بو سونگھنے کی کوشش کرنے لگے۔

باقی سانس تو نہ روک سکے منہ پر ڈھاٹے باندھنے لگے کہ شاید وبا ہوا سے پھیل رہی ہے۔ ہوا جو پہلے ہی فیکٹریوں اور کاروں کے دھوئیں اور ایرکنڈیشن کی گیسوں سے مسموم ہو چکی تھی۔ شو کے اسکول میں بچے تھے جو رال ہی بہاتے رہتے تھے، ہاتھ دھلوانا تو ان سب کا مشکل ہوتا تھا لیکن ماسک تو شو بھی نہ لگاتی۔ اسکول بند ہو گیا پھر فون آیا کہ دو بچوں کو کرونا ہو گیا ہے۔ شو بھی نڈھال سی لگ رہی تھی، اگلے دن اس کا سانس پھول رہا تھا تو میں اسے اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر، نرسیں، کلرک، اردلی سب ماسک پہنے تھے۔ شو نے انھیں دیکھتے ہی گھبرا کر چیخنے لگی۔ وہ سب سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور میں اس شور میں آواز اونچی کر کے سمجھا رہی تھی، یہ لڑکی اوٹسٹک، یہ جلد گھبرا جاتی ہے۔

شو کے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے، دو لوگوں نے اسے پکڑا ہوا تھا اور تیسرا اس کے منہ پر آکسیجن کا ماسک لگا رہا تھا۔ وہ آئی سی یو لے جائی جا رہی تھی اور مجھے ہسپتال سے باہر جانے کو کہا جا رہا تھا، "حالت بدلی تو ہم آپ کو فون کریں گے"۔ میں بہت دیر کار کے پاس کھڑی انتظار کرتی رہی۔ میرا فون نہیں بجا۔

شو گھر میں نہیں ہے اور میرا ذہن اطراف کے خالی پن کو خیالوں کے ایک ہجوم سے بھر رہا ہے۔ میں ہدایت کے مطابق گھر پہنچنے پر ہاتھ دھو رہی تھی، میرے ہاتھ پر پانی بہنے کا لمس تھا، اس کی

ٹھنڈک تھی۔ دریا کا پانی دشمن ملک سے گزر کر آتا ہے۔ اب پینے کا پانی پلاسٹک کی بوتلوں میں آنے لگا ہے۔ لوگ سگ گزیدہ کی طرح نل کا پانی پینے سے ڈرنے لگے ہیں، کیا اب کسان دریا کے پانی سے فصلیں نہیں سینچا کریں گے؟

پتہ نہیں ننو نے کچھ کھایا پیا کہ نہیں؟

پلاسٹک کی بوتلوں میں بھرنے کے لیے زمین سے اتنا زیادہ پانی نکالا جا رہا ہے کہ مادرِ گیتی کے زندگی بخش ذخائر ختم ہو رہے ہیں۔ جو بھی کنواں کھدتا ہے اس میں میٹھے پانی کے بجائے کھاری پانی نکلتا ہے۔ سمندر قریب ہے شاید اس لیے۔ اس کے کھاری پانی میں سے مچھلیاں نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں، ماہی گیر جال ڈالتے اور بمشکل پیٹ کی آگ بجھا پاتے ہیں۔

ننو کھانے کے بارے میں بڑی ضدی ہے صرف چند چیزیں ایک ہی شکل اور نرمی کی اس کے حلق سے اترتی ہیں۔

سمندر سے مچھلیاں غائب ہیں؟ شاید یہ اس وبا کا اثر ہو؟

ہمسایا ملک بڑے ٹرالر اور میلوں پھیلے جالوں سے سمندر کا پیٹ خالی کیے جا رہا ہے ادھر ساحل کے ساتھ ساتھ بننے والے محلوں کے لیے دلدلی علاقے کے مانگروو (mangrove) کاٹ کر ان اتھلے پانیوں کو پاٹ دیا گیا تھا جہاں ننھی مچھلیاں اور جھینگے پل کر بڑے ہوتے تھے۔ رہی سہی کسر ان محلوں سے بہہ کر سمندر میں آنے والے فضلے کے تیزابی اثر نے کر دی تھی۔

فون نہیں بجا۔ میں نے اسپتال فون کیا۔ ننو کو دوا سے بے ہوش رکھا جا رہا ہے، مجھے بتایا گیا "وہ آکسیجن کے ساتھ محفوظ ہے، صبح کو آ کر اسے دیکھ لیجیے گا"۔

فون بند ہو گیا۔ لیکن مجھے پتہ تھا کوئی محفوظ نہیں ہے۔ لوگ گھروں میں دبک گئے ہیں۔ اسکول خالی ہیں، بازار خالی ہیں، غریبوں کے پیٹ اور زیادہ خالی ہوں گے۔ دیہاڑی کے مزدور کے ہاں فاقہ ہو گا۔

کوئی محفوظ نہیں ہے لیکن سب برابر خطرے میں نہیں ہیں۔ غریب زیادہ مر رہے ہیں، بوڑھے زیادہ مر رہے ہیں، اچھا ہوا، اب ان کی اولادوں کو اپنے بچوں کے ساتھ بڈھے ماں باپ کو پالنے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ کئی سالوں سے اس زحمت کا بڑا چرچا تھا!

ننو کے جیسے، بچے یا بڑے مریں تو کون روتا ہے، انھیں تو ہمیشہ معاشرے نے بوجھ ہی سمجھا ہے۔ نازی جرمنی میں ان کے قتلِ عام کا کون ذکر کرتا ہے۔

ایک ہوک سی میرے دل میں اٹھی ایسا تو نہیں کہ شنو کو ضرورت کے باوجود وینٹیلیٹر نہ دیا جائے۔ میں نے گھبرا کر اسپتال فون کیا۔ کاؤنٹر پر جواب دینے والی عورت نے کہا، "حالت مخدوش لکھی ہے، اگر بدلے گی تو نرس آپکو ضرور مطلع کرے گی، جی نہیں میں بلا نہیں سکتی سب نئے آنے والے مریضوں میں مصروف ہیں"۔

اسپتال کا بل کتنے کا ہوگا؟ مجھے کل بینک سے پیسے نکال کر اسپتال جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو بل ادا نہ ہونے کی بنا پر اس کا علاج بند کر دیا جائے۔

دولت پر لگا کر اوپر سے اوپر اٹھتی چلی گئی تھی۔ ہر منڈی میں عوام کا پیسہ معاشرے کے اونچائی پر لگا دولت کو کھینچنے والا مقناطیس چھین لیتا تھا۔ لیکن ایک صدی سے اس پر احتجاج کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے ہر مصیبت کو مقدر سمجھ لیا، سوال کرنے بند کر دیے، ہمیں شنو سے سوال کرنا سیکھنا چاہیئے۔

شاید ہم سب کو بھی تن آسانی کی دوا سے نیم بے ہوشی کے عالم میں رکھا گیا تھا اور دنیا پر اس وبا کے اثرات نے ہمیں جگا سا دیا ہے۔ برسہا برس سے دھویں کے بادلوں کے پیچھے چھپے پہاڑ دوبارہ نظر آ رہے ہیں۔ انسان کی دہشت سے چھپے جانور خالی سڑکوں پر ٹہل رہے ہیں سوائے ان کے جن کو ہم دنیا سے نابود کر چکے ہیں، وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے لیکن نئی نئی وائرسیں اور بیماریاں نکلتی رہیں گی۔

میرا ذہن شنو کی طرح اس دنیا کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس جگ ساپزل کے کئی ٹکڑے کھو چکے تھے یا چرائے جا چکے تھے، یا ان سے ملتے جلتے لائچ کے ٹکڑے ان میں ملا دیئے گئے تھے۔ ان کھوئے ٹکڑوں کے بغیر میں پوری تصویر نہیں بنا سکتی تھی، ایک بے رنگ خاکے میں رنگ بھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کھڑکی صبح کی روشنی سے سفید ہو گئی تھی اور میرے کان میں فون کی گھنٹی بجنے کی آواز کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔

لڑکپن کا مکاں

بس مجھ کو سرِ راہ جہاں چھوڑ گئی تھی
کھویا ہوا میں خود کو وہاں ڈھونڈ رہا تھا

پھر لوٹ کے ایامِ گذشتہ کے چمن میں
وہ کل کی بہار اور خزاں ڈھونڈ رہا تھا

حیران و پریشان تھیں ماحول سے آنکھیں
مانوس ہوں جن سے وہ نشاں ڈھونڈ رہا تھا

اک خواہشِ موہوم کی تسکین کی خاطر
ماضی کے نظاروں کا سماں ڈھونڈ رہا تھا

چلتی ہوئی رکشا میں، تصور کی مدد سے
اجداد کے آثارِ نہاں ڈھونڈ رہا تھا

آئینۂ دل میں لیے تصویر پرانی
میں اپنے لڑکپن کا مکاں ڈھونڈ رہا تھا

اس کھوج میں اب دل کی کرن ڈوب چلی تھی
میں پھر بھی تجھے عمرِ رواں ڈھونڈ رہا تھا

کشور ناہید

شہر آشوب

کیا میں بھول جاؤں کہ میں نے کہاں جنم لیا تھا؟
بلند شہر تو میرے ذہن کی پہلی سوچ کا نام ہے
کیا میں اب وہاں کبھی نہیں جا سکوں گی؟
بھلا کیوں؟
ہندوستان چند برس پہلے تک آزاد ملک تھا
وہ اس طرح کا آزاد تھا کہ بڑھک، ہر مذہب کے لوگ
وہاں سیاحت کے لیے آتے تھے
اب ہندوستان میں گیروے رنگ کا راج ہے
وہ تو زمین اور آسمان میں موجود ہر چیز کو
گیروے رنگ میں نہلانا چاہتے ہیں
وہ جو رام جی تھے، وہ تو ہندو نہیں تھے
وہ تو خدا کا عطا کردہ نیک بندہ تھا
وہ جو سیتا تھی، اسنے اپنی زمین کو
شرمندگی کا کلنک نہیں دیا تھا۔
یہ سب ٹھیک ہے۔
مگر تم بلند شہر کیوں نہیں جا سکو گی؟
میں تو شاید دلی کیا امرتسر بھی نہیں جا سکوں گی؟
دیکھو وہ لڑکا آتیش تاثیر تھا
اس کو صرف ایک مضمون لکھنے پہ
ہندوستان کی شہریت سے نکال دیا گیا ہے۔

وہ جو کشمیر تھا
اس سے، اس کا نام بھی چھین لیا گیا ہے
وہ تو تاج محل ہے
اُسے نفرت بھری تلک لگی آنکھیں
مٹا دینا چاہتی ہیں۔
مجھے تو! جنتا ایلوہ اور کھجراؤ کی بت تراشی
آج بھی انسانی صناعی کی گواہی دیتی ہیں۔
کیا دنیا کے نقشے پہ نظر آتا ہندوستان
میرے اور میرے سارے امن پسند دوستوں کے لیے
کالا پانی ہو گیا ہے؟
ہر شہر سوائے سری نگر کے
سکائپ پہ بلاوے ہیں
کنول جیت اور امر پال بھائی
سرحد کے اس طرف کھڑے
بانہیں کھولے بلا رہے ہیں
ان کے لباس اور پگڑیاں
گیروے رنگ کی نہیں ہیں
مجھے گاندھی جی یاد آ رہے ہیں
آپ کو جس مردود نے گولی کا نشانہ بنایا تھا
آج ریاست کے فرما فروا
اُسے اوتار کہہ رہے ہیں
دلی سے رنجیت اور حنا
دیوالی پہ دیے جلانے کو بلا رہے ہیں
آئی۔آئی۔سی کی بار میں
رخشندہ اور انامیکا

خالی گلاس لیے میری منتظر ہیں
مگر ہر گلی، ہر شہر میں گیروے رنگ سے
نفرتیں، سانپ کی طرح پھن پھیلائے
کھڑی ہیں۔

شبانہ اور حارث
آؤ چلو سرحد کی جانب
ظلم بہت دن نہیں ٹھہرتا ہے
حبہ خاتون کی سرزمین پہ
سارے سیبوں کو لوگوں نے آگ لگا کر
اپنا غصہ نکال رہے ہیں
سناٹا، وحشت بن کر ناچ رہا ہے۔
اب وقت ہے
ہمیں کبیر اور غالب کی مزار بلا رہے ہیں
ہمیں کالی کٹ سے قندھار تک
پھیلے ہوئی بارودی سرنگیں اور زبانیں نہیں
گنگا اور کابل دریا کے پانیوں میں گھلی محبتیں
اور انسانیت بلا رہی ہے۔
نظام الدین اور مولانا آزاد، فاتحہ پڑھنے کو
بلا رہے ہیں۔
شیبا اور اصغر ندیم! میں تمھیں لکھنؤ یاد کرا رہی ہوں
قیصر باغ، انیس اشفاق اور نیّر مسعود کا طلسم
امراؤ جان ادا اور بیگم اختر کے بالا خانوں کو
ہم نے مل کر دیکھا تھا۔
تمھیں کلدیپ نیر کی باتیں
اور لاہور کا عشق بھی یاد آ گیا ہوگا

میری دوست اروشی نے تو
دونوں ملکوں کے بزرگوں کی یادیں
محفوظ کتاب میں کر دی ہیں۔
مگر ہندوستان اور پاکستان، دونوں
اسکولوں میں نفرت سے بھرا نصاب پڑھے
جوان ہوئے بچے، دشمنی کے زہر میں بجھے
نعرے لگا رہے ہیں
ان کو شہ دینے والے ابن الوقت
سرحد کے دونوں طرف دندنا رہے ہیں۔
بھوک اور ننگ میں لپٹے ان پڑھ بچے
اپنی وراثت سے ناواقف
انگریز دشمن کی زبان سیکھ کر
وہاں جا کے برتن دھونے کو غنیمت سمجھ کر
اپنی مٹی کی خوشبو کو بھول رہے ہیں
ہر ملک کے بوڑھے ماں باپ اکیلے ہیں۔
زمین سے رشتوں کو لباس کیے
کبھی الزائمر اور ڈمینشیا میں
یادداشت کھو کر، خلا میں گھورتے ہوئے
پرانی روایتوں کے قصے دہرا رہے ہیں
کوئی سنے یا نہ سنے
وہ یونہی صبح سے شام کرتے
کبھی وضو اور کبھی بے وضو نمازیں
وقت بے وقت پڑھتے رہتے ہیں۔
چُپ ساڑھے دلی میں ادبی محفلوں میں
راجہ کرن سنگھ اپنے بڑھاپے میں

بس فیض پڑھتے رہتے تھے
اور جموں میں اپنے محل آنے کی دعوت دیتے تھے۔
عمر عبداللہ! تمھیں یاد ہے،
تم نے جموں میں ہمیں وازوان کے بنائے
کشمیری کھانے کھلائے تھے
میں نے جب کہا اے وزیر اعلیٰ،
ہمیں سری نگر لے چلو
میری طرف اُداسی سے دیکھتے ہوئے بولے
یہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔
عمر عبداللہ! اب تو ع گیا تمھارا سارا
خاندان چار ماہ سے جیل میں ہے
وہ سارے لوگ ہم دونوں ملکوں کے
جو سچ بول نہیں سکتے، گویا قید میں ہیں
یہاں تو بولنے والوں کو کبھی سڑک
اور کبھی گھر سے اٹھا لیا جاتا ہے۔
پھر کبھی ان کا سراغ نہیں ملتا ہے۔
تم کشور ناہید
یہ سب دیکھ، پڑھ اور سن رہی ہو
اور جی رہی ہو
کتنی بے غیرت ہو
کتنی بے بس ہو
اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ
بزدل ہو، نہیں کر سکتی ہو۔
تم پچھلے دنوں
مولویوں کے دھرنے سے

پر امید تو نہیں، پر مایوس بھی نہیں تھیں
کاک ٹیل برقعے سکولوں میں بانٹتے
لوگوں پہ تین حرف بھیجتی
بس بڑبڑاتی رہتی ہو
آخر کب تک!
جسٹس کاٹجو اور جاوید اختر بمبئی میں
کبھی کبھی بول لیتے ہیں
ہمارے ملک میں برلز کے طعنے دینے والے
سارے چینلوں، سارے میڈیا پہ راج
کر رہے ہیں
بہت کتابیں اور اخبار
بہت پولیس، بہت عدالتیں
بہت ہاتھوں میں ریوالور
بہت نامعلوم ہاتھ
بیبا ملنے والی لڑکیوں کو مارتے ہیں نامعلوم لوگ
کچھ بھی تو پتہ نہیں چلتا
چناروں کے دیس میں بھی
یہی ہو رہا ہے۔
وہاں تو سرکار کی مرضی سے
لڑکیوں کو لباس سے آزاد
کیا جا رہا ہے۔
یہی بہادری دونوں ملکوں میں ہے
اک زمانہ تھا
کملا اور عاصمہ اکٹھی
ان کے گیت گاتی

ہزاروں کو ساتھ لیکر چلتی تھیں۔
کہاں گئے وہ ہزاروں لوگ
اب تو گیروے رنگ والے۔
پیشاب پینے کی فضیلت
بیان کرتے ہیں۔
راحت اندوری اور وسیم بریلوی
منہ چھپائے پھرتے ہیں۔
پاکستان میں فیس بک پر
غلطی سے ٹاپسٹ آرمی نامہ لکھ دے
اس شخص کا اکاؤنٹ بند کر دیا جاتا ہے۔
دونوں ملکوں میں دھمکیوں کے آسیب ہیں
دونوں ملکوں کے اینکر
وہ بولتے ہیں، جس کی ہدایت ملتی ہے۔
بچیوں کے ساتھ زیادتیوں کو
بتانے کا بھی کیا فائدہ۔
بچوں کی جنسی زیادتی کی فلمیں
بنانے والا تو حکومت بنا بیٹھا ہے۔
بس کرو۔
دیکھا نہیں ٹی۔ وی کی بولتے بولتے
آواز بند ہو جاتی ہے
چپ کرو۔
صوفیا پہ حرف زغت کرو۔
زعفران کے کھیت دیکھنے والی
آنکھیں، گولیاں کھا چکی ہیں۔
نیتن بوس اور رحمان صاحب بھی

چپ ہیں۔

کشور ناہید

تم کس کس کا نوحہ لکھو گی
کس کس کو چپکاؤ گی
چمگادڑیں الٹی لٹک کر ہی
سویا کرتی ہیں۔
دیکھو مت، لکھو مت، بولو مت
باہر بہت طوفان ہے۔
جانے کس کس کو بہا کر
لے جائیگا!

ڈاکٹر فاطمہ حسن

اب ہم محفوظ ہیں

محفوظ ہیں ہم
اپنے گھروں میں
پناہ گاہوں میں
تنہائی میں
اور آدمی سے دوری میں

مصروف ہیں
میرے گھر والے
سب پیارے
اپنے پسندیدہ مشاغل میں

محفوظ ہیں میرے بچے
اس آدمی سے
جو ان کی زندگی کی
قیمت پر لے گیا تھا
گھر کا قیمتی سامان
میرے قلم اور انکے کھلونے

سینچ رہی ہوں میں
کیاریوں میں پودے

دیکھتی ہوں کھلتے پھولوں
اڑتی تتلیوں کے رنگ
سنتی ہوں پرندوں کی آوازیں
پتوں کی سرسراہٹ
شور نہیں سر پر
ان طیاروں کا
لاتے ہیں جو ہتھیار
جراثیم اور غربت کے اسباب

آج میں تنہا گھر سے نکلوں گی
آدھے چہرے کو ململ کے دوپٹے سے
ڈھانپ کر
ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر
جو اس دن بھی تھے
جب ایک آدمی نے میرا
موبائل فون چھینا تھا
میرے والدین کی قبروں کے نمبر
بچوں کی تاریخ پیدائش
عزیزوں کے رابطے
سب چھن گئے تھے میرے ہاتھ سے
اب جنہیں بچانا ہے
صرف جراثیم سے

محفوظ ہوں اب
اپنی ذات کی پناہ میں

مطمئن ہوں کہ میری موت
طبعی ہوگی اپنے گھر میں

پرندے چہچہاتے ہیں

فضا میں موسمِ گل کی
خنک سی تازگی پھیلی ہوئی ہے
جہاز اور موٹروں کے شور سے محفوظ دنیا میں
دھوئیں اور دھول سے عاری فضا میں
پرندے چہچہاتے ہیں
میں اپنے نیم وا روشن دریچے میں
نہ جانے کب سے چپ بیٹھی
یہ منظر دیکھتی ہوں
جہاں بے جان شاخوں پر
سنہری کونپلیں سی پھوٹ نکلی ہیں
انہیں میں اکا دکا زرد پتے
شاخ سے چمٹے ہوئے اب تک
بقا کی جنگ لڑتے ہیں
لچکتی نرم و نازک شاخ پر
خوش رنگ تتلی رقص کرتی ہے
میں کھڑکی میں
نہ جانے کب سے چپ بیٹھی
یہ منظر دیکھتی ہوں
مرے چاروں طرف جتنے مکاں ہیں
سب مقفل ہیں

گلی سنسان ہے
بچوں کی آوازوں سے خالی راستوں میں
ایک ویرانی کا ڈیرہ ہے
میں اس نیرنگیِ فطرت پہ حیراں ہوں
پرندے چہچہاتے ہیں تو لگتا ہیں
کہ فطرت آدمی کو منہ چڑاتی ہے
یہ اس کی بے بسی پر مسکراتی ہے

تنویر انجم

آؤ وعدہ کریں

(کرونا کے بعد کی پہلی نظم) اپریل ۲۰۲۰

آؤ وعدہ کریں
مل کے اک ساتھ آؤ ارادہ کریں
آؤ وعدہ کریں

اب کبھی رنگ و مذہب کی تفریق کو
نسل کے یا زباں کے کسی فرق کو
برتری کی کسوٹی نہیں ماننا
(جو ہُوا، سو ہُوا، اب نہیں ماننا)
یہ کچھ بھی سوچیں بنا اب نہ بولیں گے ہم
کیا پہیلی ہے کیا بھید ہے زندگی
اس طلسمات کو مل کے کھولیں گے ہم
اب سے لے کر کہانی کے انجام تک
ایک جیسا رہے آسمان کے تلے
سانس لینے کا اور سب کے جینے کا حق
مشترک ایک چشمہ ہے یہ زندگی
اور ہے ایک سا سب کے پینے کا حق

شاہدِ گل کو بازار میں لائے گی
اب نہ زر کی ہوس!

آدمی کا تعارف نئے دور میں
آدمی ہوگا، بس

رزق جو خدا نے زمین کو دیا
سب میں تقسیم ہو
چاندنی اور برائی طرح سب کو یہ
ایک جیسا ہے
وہ جو منہ زور طاقت کا قانون تھا
اس میں ترمیم ہو!

جس کا جتنا بنے وہ اُسی کو ملے!
چند افراد کے
اک تعصب میں ڈوبے عمل کی سزا
یہ مناسب نہیں ہر کسی کو ملے
کسی ایک نقطے کے خم کی دُھن
دائرہ کیوں سہے!
اک مسافر بھٹک جائے گر راہ سے
اُس کو تفریر پر مشتمل فیصلہ
قافلہ کیوں سہے!
کوئی قلم یہودی کہ عیسائی ہو
ہو کسی بھی عقیدے سے وابستگی
یا کسی بے یقینی کا سودائی ہو!
اس سے کچھ واسطہ
اُس کے ایمان کا یا دھرم کا نہیں
مسئلہ یہ کسی بیش و کم کا نہیں

سب کا مجرم ہے وہ
ہو وہ مسجد کہ مندر کہ گرجا کوئی
ان کی تقدیر پر جو بھی حملہ کرے
سب کا مجرم ہے وہ!
زندگی ہے سمندر کنارا نہیں
مل کے چلنے سوا اب گزارا نہیں
جو بھی کچھ ہے یہاں، ہے وہ سب کے لئے
کچھ ہمارا نہیں، کچھ تمہارا نہیں!
ابنِ آدم کی عزت کی بنیاد اب
زور و زر نان ہے
کوئی کہہ نہ سکے
''چین سے زندگی چاہئے ہو اگر
میرے دربار میں آ کے سجدہ کرو
صرف میری سنو اور کچھ مت کہو
چپ رہو، چپ رہو''

جو چلن تھا غلط اب وہ تبدیل ہو
عزتِ نفس محفوظ سب کی رہے
اور کہیں پر کسی کی نہ تذلیل ہو!

جو ہوا اُس کی غائت ہے یہ سربسر
اُس کی عبرت سے ہم استفادہ کریں
آدمیت کی دشمن کسی بات کا
اب نہ حصہ بنیں نان اعادہ کریں
ہے یہی زندگی کے مسائل کا حل

جس قدر ہو سکے اِس کو سادہ کریں

سچ کے پھیلاؤ میں خیر ہی خیر ہے
درگذر، وہ سفر، جس میں خطرہ نہیں
درد کی ناؤ میں خیر ہی خیر ہے

جبکہ مشکل نہیں راستہ خیر کا
پورے دل سے اگر ہم ارادہ کریں
آؤ وعدہ کریں
آؤ وعدہ کریں

شہر

شہر خاموش ہے
سہمے ہوئے بچے کی طرح
شہر بے یار ہے
تنہا ہے بہت
شہر کی آنکھ کو کوئی شناسا چاہیے ہے
اب اس کے پالنے کو اک خدا سا چاہیے ہے
خوف
خوف اتنا ہے کہ بس گھر کو تکا کرتا ہوں
یہ جو دروازہ ہے یہ کتنا پرانا ہوگا
اک دہائی
نہیں
کچھ اس سے بھی تھوڑا بڑھ کر
ہے مگر یہ بھی
زوال آمادہ
یہ جو برتن کو لٹکایا ہے ذرا ترچھا سا
ان کے گرنے سے کہیں فرش جو ہوگا زخمی
کیا ہوگا
یہ جو بلی مری چوکھٹ سے لگی رہتی ہے
اس کو گر آن لیا خوف کے سناٹے نے
کیا ہوگا

گھر میں اک پودا ہے
چھوٹا موٹا
سانس تو یہ بھی لے رہا ہوگا
یہ بھی کیا مجھ کو دیکھتا ہوگا

قرنطینہ

زندگی میں یہ پہلا موقع ہے
کہ میرے اندر باہر ایک جیسا سناٹا ہے
چڑیوں اور بچوں کا شور بھی
اس سناٹے کو کم نہیں کر پا رہا

خود کو زندہ رہنے پر اُکسانے کا عمل
اب روزانہ کی بنیاد پر کرنا پڑتا ہے

دیمک کی طرح پھیلتی فراغت
مصروفیت کے بہانے کھوکھلے کیے دے رہی ہے

کتنی ہی کتابیں
میرا انتظار کرتے کرتے
بوڑھی ہو چکی ہیں
ان میں کچھ میری محبوبائیں بھی ہیں
جن سے محض سرسری ملاقات ہی رہی

اور اب فرصت کے اس بے کنار منظر میں
میری نظر شلیف کی طرف نہیں اُٹھ رہی

کچھ ادھوری نظموں کو
یک دم امید سی ہو چلی تھی
لیکن مَیں کیا کروں
مَیں دن میں کئی بار ہاتھ دھوتا ہوں
اور ان نظموں پر پانی ڈال آتا ہوں

زندگی اور مَیں

زندگی!
اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہوئی زندگی!
آج خاموش ہے،
شہر خاموش ہے،
گیت خاموش ہے۔

زندگی!
برسرِ خواب و تعبیر آتی ہوئی زندگی!
آج معزول ہے،
ربط معزول ہے،
لمس معزول ہے۔

زندگی!

وقت کی تھاپ پر والہانہ تھرکتی ہوئی زندگی!
آج بیزار ہے،
شوق بیزار ہے،
جوش بیزار ہے۔

اور مَیں!
زندگی کو صدائیں لگاتا ہوا
دائمی خفتگی سے بچاتا، جگاتا
اُسے رقص کرنے کی ترغیب دیتا ہوا ایک مَیں!

آدم زاگاجووسکی
ترجمہ: دانیال شیرازی

دنیا کا خاتمہ

چند یا کچھ اور برسوں کے بعد
ایک بار پھر سے دنیا کا اصل خاتمہ ہو جاتا ہے
چار مسافر زمین پر سفر کرتے ہیں

نیا سا موٹر کار میں
جو اس بڑے جسم کی مغربی سرحد بھی ہے

دنیا کا خاتمہ ہمیشہ رات کو ہوتا ہے
جب آپ اپنے بھوکے آباواجداد کو اپنے خوابوں کی غذا فراہم کر رہے ہوتے ہیں
چند گھنٹوں میں ہی تصاویر دھندلی ہو جاتی ہیں
اور زبان بدل جاتی ہے
جو کل سے آپ فخریہ طور پر استعمال کریں گے
یہ وہ لمحہ ہے جب الفاظ موثر نہیں رہ جایں گے
اور ابھی تک نئے الفاظ نہیں آیے
جب تمام فتوحات
سادہ غلطیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں
غلطیاں اپنا دوہرا چہرہ دکھاتی ہیں
اور امید اپنی صفائی میں بیان دینا چھوڑ دیتی ہے
ایک لفظ بھی نہیں

اور نہ کسی کی طرف اشارہ کرتی ہے

یہ ایک ایسا لمحہ ہے
جس میں کچھ بھی نہیں ہے
نہ محبت، نہ ایمان
اور دنیا رک جایے گی
دو انسانوں کی طرح جو اپنی طاقت کھوتے جا رہے ہیں
اور صرف گہری نیند کی بدولت
اس خواب میں جس میں آپ اچانک
اپنے عہد میں دو ہزار سال کے بوڑھے ہو جاتے ہیں
اور اس دن کی طرح جوان
جو ابھی نہیں آیا

ایوالیپسکا
ترجمہ: دانیال شیرازی

اعتماد

تاریخ میں ایک ایسا ہی امتحان اس پہلے موجود ہے
جب تمام طالب علم فورا ناکام ہو گیے تھے
اور ایک رسمی قبرستان ان کے بعد باقی رہا

یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ایک امتحان تھا
یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ سب کے سب ناکام ہوگیے تھے
یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایک رسمی قبرستان ان کے بعد باقی رہے گا

ایسی محبت اس سے پہلے موجود تھی
یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ہماری تھی
ایسے لوگ اس پہلے موجود تھے
یقین کے ساتھ نہیں ں کہا جاسکتا کہ وہ ہم تھے
ایسے اڑنے والے ٹرانوڈون اس سے پہلے موجود تھے
یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا وہ ہمارے زمانے میں ہیں
ایسی زبان اس سے پہلے موجود تھی
یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے اس سے بات کی تھی
ایسی چپ اس سے پہلے موجود تھی
یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہمارے درمیان تھی
یہ دنیا کا خاتمہ تھا

مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہماری دنیا ہے

اور ایک رمی قبرستان اس کے بعد باقی تھا
یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد ایک رمی قبرستان باقی رہے گا

زسلاومیووش
ترجمہ: دانیال شیرازی

دنیا کے خاتمے کا گیت

دنیا کے خاتمے کے دن
ایک مدھ مکھی گلِ عنبر کے گرد منڈھلا رہی ہے
ایک مچھیرا ایک چمکدار جال کی مرمت کر رہا ہے
دولفنیں خاموشی سے سمندر میں اچھل رہی ہیں
ننھی چڑیایں نالے کے پاس جمع ہیں
اور سانپ کی کھال سنہری ہے، جیسا کہ اسے ہونا چاہیے
عورتیں چھتریاں تانے میدان سے گزر رہی ہیں
نشے میں چور کچھ لوگ لان کے کنارے سوتے پڑے ہیں
سبزی بیچنے والے سڑک پر آواز لگا رہے ہیں
اور پیلے بادبان والی ایک کشتی جزیرے سے آ گئی ہے
اور وایلن کی دھن ہوا میں مرتعش ہے
اور تاروں بھری رات ختم ہو جاتی ہے
اور جو بجلی اور کڑک کا انتظار کر رہے تھے
ناامید ہو رہے ہیں
وہ یقین نہیں کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ دوبارہ ہو رہا ہے
جب تک کہ چاند اور سورج آسمان پر ہیں،
جب تک کہ بڑی مدھ مکھی گلاب کی طرف جاتی رہے گی
جب تک کہ گل گوتھنے بچے پیدا ہوتے رہیں گے
کوئی بھی یقین نہیں کرتا کہ اب ایسا ہونے جا رہا ہے

صرف ایک سفید بالوں والا آدمی
جو کوئی پیش گوئی کرنے والا ہو سکتا تھا
مگر وہ پیش گوئی کرنے والا نہیں ہے کیوں کہ اس کا پیشہ کچھ اور ہے
وہ تماٹروں کی گانٹھیں باندھتے ہوئے کہہ رہا ہے
دنیا کا کوئی اور خاتمہ نہیں ہوگا
دنیا کا کوئی اور خاتمہ نہیں ہوگا

جارج زرٹس
ترجمہ: تنویر انجم

زمانۂ جنگ

مانع خور بیٹھے ہیں
الماری میں
صاف ستھری باز میں
چور چھپے ہیں
افواہیں پھیلی ہیں
اور خطرے کی گھنٹیاں
زمانہ ہی ایسا ہے
وہ کہتے ہیں

میری محبوب!
یہ ذاتی اضطراب کے دن ہیں
ننھے پرندوں کی بلند ہوتی باریک
آواز کو سنو

مجھے بوسہ دو

مانل اے
ترجمہ: تنویر انجم

کووِڈ 19 کے بارے میں ایک نظم

اپنے ہاتھ دھو، باہر مت نکلو
اگر جانا ہی پڑے تو ماسک پہنو
کہیں ایسا نہ ہو کہ تم
کسی ناخواستہ تابوت میں پہنچ جاؤ
ہم خود کو دوسروں سے دور رکھے
سڑک پر نکلے بغیر
اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لیے کوشاں
تھوڑے میں گزارہ کرتے ہوئے
جبکہ بیزور، ماہ، زکر برگ اور گیٹس
سر چکرا دینے والی شرحوں پر
منافع کما رہے ہیں
اور بڑی دوا ساز کمپنیاں
بڑی ویکسین تمام ملکوں میں
مہیا کر دیے جانے کی فکر میں
اپنے ہاتھ مروڑ رہی ہیں
اور جب لوگ بڑا ٹیکہ لگوانے کے لیے
قطار بنائیں گے۔
میں ایک کورونا اٹھاؤں گا
اور اسے پی جاؤں گا۔

پھر یہ میری کمپنی ہے
جو سمجھتی ہے
کہ ساٹھ فیصد تنخواہ پر
ہماری ملازمتیں جاری رکھنا ٹھیک ہے
اب جبکہ ضروریات زندگی کی قیمتیں
گراں سے گراں تر ہوتی جارہی ہیں
ہیڈ آفس میں بیٹھے یہ سوٹوں میں ملبوس
خود کو آئینے میں کیونکر دیکھ پاتے ہیں۔

ہم بغیر احساس جرم کے
ریستورانوں میں اور فلم بینی کے لیے نہیں جاسکتے۔

کوئی سماجی رابطہ نہیں
بغل گیری نہیں، بوسہ نہیں
یہ کوئی مذاق نہیں ہے
اگر کھیل واپس بھی آجائیں
تماشائیوں کی کرسیاں خالی رہیں گی
میں تو اس کووڈ 19 سے عاجز آیا
مرا جاتا ہوں، اپنے ہاتھ دھوتا ہوں

دنو شالیمیرس
ترجمہ: تنویر انجم

انشاء اللہ

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دعا کی طاقت بہت
اہم ہے اور ہمیں مشکل ترین زمانوں سے گزار سکتی ہے
مجھے نہیں معلوم یہ کب میری زبان میں اتر آئی۔
یہ نرم لفظ جس کا مطلب ہے "اگر خدا نے چاہا تو"
انشاء اللہ میں اگلے موسمِ گرما میں تم سے ملوں گی
بچہ بہار میں پیدا ہوگا، انشاء اللہ
انشاء اللہ اس سال بارش ہماری ضرورت کے
مطابق ہوگی۔
میرے بنائے ہوئے کتنے ہی منصوبے ہیں جو آسانی سے سلجھتے گئے۔
جیسے کہ میری ماں کی تیز انگلیوں کے نیچے بالوں کی چوٹیاں
ہر زبان میں اس کے لیے ایک لفظ ضرور ہونا چاہیے
ایک لفظ جو ہماری دادیاں اپنی سانس تلے دبا کر ادا کرتی تھیں
سفید چادروں کو پنوں سے اپنی جگہ لگاتے ہوئے
انہیں لیموں کے رنگ میں بھگوتے ہوئے
دھوپ میں سکھانے کے لیے لٹکاتے ہوئے
یا آلو چھیلتے ہوئے
اور ان کے چھلکے ایک پیالے میں پھینکتے ہوئے
ہمارے بیٹے اگلے مہینے لوٹ آئیں گے۔ انشاء اللہ
انشاء اللہ یہ جنگ ختم ہو جائے گی

انشاء اللہ چاول پوری سردیاں چل جانے کے لیے
کافی ہوں گے
کتنے سرسری انداز میں ہم امید کو تھامے رکھنا سیکھتے ہیں
جیسے کہ یہ ایک جانور ہو جو پلٹ سکتا ہو
اور ہمارا ہاتھ کاٹ سکتا ہو
اور پھر بھی ہم اسے لیے پھرتی ہیں
جیسے کہ کوئی ماں کرے گی۔
احتیاط سے، ایک دن سے دوسرے دن تک

دنو شالیمیرس
ترجمہ: تنویر انجم

چھوٹی چھوٹی مہربانیاں

میں سوچتی رہی ہوں
کہ جب تم ایک پرہجوم تنگ راستے سے گزر رہے ہوتے ہو
تو کس طرح لوگ ہمیں راستہ دینے کے لیے اپنی ٹانگیں
اندر کرتے جاتے ہیں۔
یا کس طرح اجنبی لوگ کسی کی چھینک پر کہتے ہیں
''آپ پر رحمت ہو'' ہو بو بونگ طاعون کی یادگار دعا
''تم مرنا نہیں'' ہم کہہ رہے ہیں۔
اور کبھی جب تم سے اپنے سودے کے تھیلے سے
لیموں گر جاتے ہیں۔
تو کوئی اور بھی انہیں اٹھانے میں تمہاری مدد کر دیتا ہے۔
زیادہ تر ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے
ہم چاہتے ہیں کہ ہماری گرما گرم کافی کا پیالہ ہمیں
تھمایا جائے اور ہم اسے تھمانے والے شخص کو
''تمہارا شکریہ'' کہیں
ہم کسی کو دیکھ کر مسکرائیں اور وہ جواباً مسکرائے کھانا پیش کرنے والی لڑکی ہمیں ''پیاری'' کہے
جب وہ ہمارے سامنے گھونگے کا سوپ رکھ رہی ہو
اور لال پک اپ ٹرک کا ڈرائیور ہمیں پہلے جانے کے لیے
راستہ دے
ہم ایک دوسرے کو اب اتنا کم حاصل ہیں

قبلے اور الاؤ سے اتنی دور
گفتگو کے صرف یہ چند مختصر لمحے
کیا ہوا اگر یہ خدا کی سچی رہائش گاہیں
ہوں، یہ عارضی معبد جو ہم تعمیر کرتے ہیں
جب ہم کہتے ہیں
"یہاں آئیں، یہ میری نشست آپ لے لیں"
"چلیے، آپ پہلے"
"آپ کا ہیٹ (hat) اچھا لگ رہا ہے"

جان اڈاناہیو
ترجمہ: تنویر انجم

ہمارے درمیان فاصلے پر رحمت

(اقتباس)

یہ وقت ہے آہستہ روی کا
دیوار کے ساتھ چھپے پڑے رہے گا
جب تک کہ یہ تلخ موسم گزر نہیں جاتا
کوشش کرو جس حد تک ممکن ہو
کہ تار سے بنا شک کا برش
تمہارے دل سے
تمہاری ذات کے احساس کو
اور ہچکچاتی روشنی کو
کھرچ نہ ڈالے
اگر تم نے اپنی دریا دلی برقرار رکھی
تو اچھا وقت آئے گا
اور تم اپنے قدموں کو
امید کی چراگاہوں میں پاؤ گے
جہاں فضا ایک نئے آغاز کی
سرخی سے چہرہ سجائے
مہربان ہوگی

وینڈی کوپ
ترجمہ: تنویر انجم

مالٹا

لنچ کے وقت میں نے ایک بہت بڑا مالٹا خریدا
اس کی جسامت کو دیکھ کر ہم سب ہنسے
میں نے اس کو چھیلا اور رابرٹ اور ڈیو کو بھی دیا
ان دونوں کو چوتھائی حصے ملے اور مجھے آدھا
اور وہ مالٹا! اس نے مجھے کیا ہی خوشی دی۔
جیسا کہ معمولی اشیاء اکثر دیتی ہیں۔
ابھی کچھ ہی دیر پہلے۔ خریداری، پارک میں چہل قدمی
یہ سکون ہے اور قناعت، یہ نئی چیز ہے۔
باقی تمام دن خاصا آسان گزرا۔
میں نے فہرست میں درج تمام کام کیے
اور ان کا لطف اٹھایا
اور کچھ وقت بچ بھی رہا
میں تم سے محبت کرتی ہوں
میں خوش ہوں کہ مجھے زندگی ملی۔

کٹی اومیارہ
ترجمہ: تنویر انجم

اور لوگ گھروں میں رہے

اور لوگ گھروں میں رہے
اور انہوں نے کتابیں پڑھیں اور سنیں
اور آرام کیا
اور ورزشیں کیں اور فن تخلیق کیا
اور کھیل کھیلے
اور جینے کے نئے انداز سیکھے
اور سکوت کو اپنایا
اور زیادہ توجہ سے باتیں سنیں
کچھ نے مراقبہ کیا، کچھ نے عبادت، کچھ نے رقص
کچھ نے اپنے سایوں سے ملاقات کی
اور لوگوں نے مختلف انداز سے سوچنا شروع کر دیا۔
اور وہ شفایاب ہوئے
اور لوگوں کے جاہلانہ، خطرناک، احمقانہ اور
سنگدلانہ طریقوں کی غیر موجودگی میں
زمین بھی شفا پانے لگی
اور جب خطرہ گزر گیا
اور لوگ ایک بار پھر اکٹھے ہوئے
تو وہ اپنے نقصانات پر آزردہ ہوئے
اور انہوں نے اپنی ترجیحات کو بدل دیا

اور نئے منظروں کے خواب دیکھے
اور زندگی گزارنے کے لیے
اور زمین کو مکمل صحت یاب کرنے کے لیے
نئے انداز تخلیق کیے
کیونکہ وہ خود شفا پا چکے تھے

فلپ لارکن
ترجمہ: تنویر انجم

گیاہ تراش

گیاہ تراش رک گیا، دو دفعہ
گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے دیکھا
ایک خارپشت اس کے پھل سے کٹا ہوا بھرہ
وہ لمبی گھاس میں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا
اسے کھانا بھی دیا تھا ایک بار
اب میں نے اس کی خاموش صفت دنیا کو
ادھیڑ ڈالا تھا
تدفین باعث تسلی نہ ہوئی

اگلی صبح میں بیدار ہوا، اور وہ نہیں
موت کے بعد کا پہلا دن، نئی عدم موجودگی
ہمیشہ ایک سی ہوتی ہے
ہمیں محتاط رہنا چاہیے
ایک دوسرے کے لیے
ہمیں نرم دل ہونا چاہیے
اس وقت جب، ہمارے پاس مہلت ہو۔

لیلا دھر منڈلوئی
ترجمہ: انعام ندیم

میں انھیں کیوں ڈھونڈ رہا ہوں

میں نکلتا ہوں روز اور
لوٹتا ہوں ایک عدد سوال کے ساتھ
میں بے تاب ہوتا ہوں، جواب کے لیے
دو بار پولیس والوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا

مجھے کئی بیماریاں ہیں
بلڈ پریشر، ذیابیطس، آرتھو پیڈیکس، آنکھوں کی تکلیف وغیرہ
اور کوئی نہ کوئی بھلا پولیس والا
جانے دیتا ہے اسپتال کے کاغذ دیکھ کر

میں راستے سے گزرتے ہوئے
دیکھتا ہوں، ان جگہوں کو جہاں کھڑے ہوتے تھے
ریزگی والے، ٹھیلے والے، کھوکھے اور گمٹی والے
وہ اب نہیں ہیں وہاں

وہ کہاں ہوں گے ان دنوں اور ان کے گھر والے
اور ان کی روز کی بھوک، بنا خوراک کے
ڈھونڈتے ہوئے
کل مل گیا ان میں سے ایک

سبزی کا ٹھیلا کھینچتے ہوئے

میں نے اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھی
اور اس نے ایک لمبی سانس بھری بس
اسی میں تھا ٹھیک ٹھیک جواب

کہا اس نے اب ہم میں سے کئی تو
رات بارہ بجے مل جاتے ہیں اوکھا منڈی میں
کسی طرح اُس ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی بھیڑ میں
پولیس کے چمکتے ڈنڈوں کے بیچ
کچھ نہ کچھ خرید پانے کے لیے
نہ سہی سبزی تو پھل ہی سہی

تو ہم سبزی، پھل بیچ رہے ہیں
یا گھر گھر دودھ دہی کی ترسیل کر رہے ہیں
اور کچھ میڈیکل اسٹورز سے لوگوں کی
دوائیاں پہنچا رہے ہیں
کچھ انڈے، بریڈ، بسکٹ کے ٹھیلے والے بن گئے ہیں
بتایا اس نے جھجکتے ہوئے کہ پان گٹکے والے
چوری چھپے بیچنے پر مجبور ہیں
بچوں کو بھوکا تو نہیں رکھ سکتے نا صاحب

اور پھر اس نے لگائی اونچی آواز
'سبزی لے لو، تازہ تازہ سبزیاں'
کہیں دور سے آواز گونجی 'پھل لے لو

سنترے، تربوز، خربوزے، کیلے، انناس، انگور اور چیکو'

ہاں! بابو جی
جو نظر نہیں آ رہے، ان میں سے کچھ کیمپ میں پھنسے ہیں
اور کچھ کا پتہ نہیں

بابو جی کچھ دوں؟ مٹر میٹھے ہیں
میں خریدتا ہوں مٹر

حالانکہ وہ کافی ہیں گھر میں
آخر کل پھر آنے کا کہہ کر
بھاری قدموں لوٹتا ہوں گھر

وہ لگ بھگ روز سپنے میں آتے ہیں
وہ کچھ بولتے ہیں
اور آواز سماعت سے باہر ہوتی ہے

سپنوں میں ان کے زندہ رہنے کا احساس
کیا واقعی؟

کلدیپ کمار
ترجمہ: انعام ندیم

راگ کورونا

موت وہ راگ ہے
جس کا سُر تو وہی رہتا ہے
لیکن ہر بار نام بدل جاتا ہے
جب اسے
جیون گاتا ہے
ان دنوں اسے
کورونا کہتے ہیں

یہ اکیلا ایسا راگ ہے
جس میں صرف اور وہ ہے
آروہ نہیں
مرکیاں کب ہچکیاں بن جائیں گی
گانے والے کو بھی پتہ نہیں ہوتا
اس راگ کے پھیلے ہوئے پھن پر
تانڈو کا ناچ ہوتا ہے
کورونا بھی آجائے تو
سواگت ہوتا ہے
دیکھیے تو
تھالیاں اور تالیاں

دونوں بج رہی ہے
دیپ جل رہے ہیں
پٹاخے چل رہے ہیں
لوگ پٹاپٹ مر رہے ہیں

چاندنی رات میں لوگ سہمے سے جا رہے ہیں
موت نہیں مانتی
چھ فیٹ دور رہنے کا قانون
بھی کیا
وہ تو کوئی بھی قانون نہیں مانتی
اور زندہ رہتی ہے
ہمیشہ، مستقل۔

وجے کمار
ترجمہ: انعام ندیم

لاک ڈاؤن

لفظوں کے لیے سارے ایجنڈے متعین کر دیے، ہیں آقاؤں نے
دھرم گروؤں نے
مولاناؤں نے
ان پنڈے، پروہتوں، مولویوں نے
متکبر نوکر شاہی نے
خالی کنستر کی طرح بجتے قومی قائدین نے
دارالسلطنتوں، اکادمیوں میں بیٹھے بھاٹوں اور چارنوں نے
اور لفظوں کی پوٹلی اٹھائے
بوجھ لادے سر پر
اور اپنی روح پر
بھوکے پیاسے بے عزت
بے دخل کیے ہوئے
در در بھٹکتے، پٹتے
دم توڑتے
وہ تارکینِ دنیا
جسم ٹوٹا ہوا، سانس پھولی ہوئی
پاؤں میں چھالے
اور آنکھیں سوجی ہوئی
وہ تارکین دنیا جو گمنام ہیں

جن کی کوئی پہچان ہی نہیں
وہ تاریکین دنیا
جو جانتے ہیں شاہراہ ان کے لیے نہیں
وے شاہراہوں سے اتر کر
کچی پگڈنڈیاں ڈھونڈھتے ہوئے
جن پر گھر لوٹنے کے راستے شاید انھیں مل جائیں
اگر وہ گھر اب بھی نہیں بچے ہوئے ہوں۔

اشول واجپائی
ترجمہ: انعام ندیم

ہم اپنے وقت کو لکھ نہیں پائیں گے

یہ ٹھہرا ہوا اُجاڑ وقت
جس میں پرندے اور چڑیاں تک خاموش ہیں
جس میں روز مرہ کی آوازیں نہیں، بس بازگشت ہے
جس میں دعائیں، پکار اور آہیں، سب ماتم کناں ہیں خاموشی میں
جس میں کہیں دبکی ہوئی ہے، ہم نشینی
جس میں ہر چیز پر خاموشی وقت کی طرح پھیل گئی ہے

ایسے وقت کو ہم کیسے لکھ پائیں گے
معلوم نہیں یہ ہمارا وقت ہے
یا ہم زبردستی کسی اور وقت میں آ گئے ہیں
اتنا سپاٹ ہے یہ وقت
کہ اس میں کوئی سلوٹ، کوئی پرت یا دراڑ نظر نہیں آتی
اور اس سے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں سوجھتی
ہم اپنے وقت کو نہیں لکھ پائیں گے

یہ وقت آہستگی کے ساتھ چل رہا ہے
لگتا ہے سب گھڑیوں نے سست روی ٹھان لی ہے
بے موسم ہوا سرد ہے
اگرچہ بہار کا موسم ہے اور پھول کھلکھلا رہے ہیں

گویا ہمارے برے وقت پر خندہ زن ہوں
اور گلہریاں تیزی سے بھاگتے ہوئے
منہ چڑاتی پیڑوں اور کھمبوں پر چڑھ رہی ہیں
یکایک جیسے کبوتر کچھ کم ہو گئے ہوں
دہاڑی دار مزدوروں کی طرح
اپنے گھر گاؤں جانے کی تکلیف دہ مسافت پر نکل گئے ہوں
ہمیں اتنی تسلی تو ہے

اپنے وقت میں چاہے نہ سہی، ہم اپنے گھر میں تو ہیں

امید کسی کچرے کے پڑے رہ جانے والے حصے کی طرح
کسی کونے میں دُبکی پڑی ہے
جو آج نہیں تو کل سمیٹ کر پھینک دی جائے گی
ہم اپنے وقت کو لکھ نہیں پائیں گے۔

زمین کی خیر ہو

صبح کی ٹھنڈی ہوا میں
اپنے لاتعداد سبز رنگوں میں
چمک رہی ہوں
انار، لیموں، نیم، حنا، املتاس
بوگن ویلیا، زعفران اور سہجن کی پتیاں
دھوپ ان کے سبز رنگوں پر مزے سے پھسل رہی ہے
میں سنتا ہوں ان کی باہمی دعا

زمین کی خیر ہو!

ایک سبز کورس گیت ہے
دھیمی لے کی بہار کے اکسانے پر
جس میں طرح طرح کے بے نام پھول
سُروں کی طرح ملائم ضربیں لگا رہے ہیں
سب گنگنا رہے ہیں
بھلائی دینے والے منتر زمین کے لیے
سائیکل پر ایک لڑکی لگاتار چکر لگا رہی ہے
کھڑکیاں بالکنیاں کھلی ہیں مگر خالی ہیں
تنہائی کسی نئے شفاف آسمان کی طرح
سب پر چھائی ہوئی ہے
لیکن آہستہ آہستہ بہت دھیمے بہت دھیرے سے
تنہائی بھی گا رہی ہے زمین کے لیے خیر سگالی کا گیت

گھروں پر، دروازوں پر
کوئی دستک نہیں دیتا
پڑوس میں کوئی کسی کو نہیں پکارتا
گہرے سکوت میں صرف ہوا کی طرح غیر مرئی
دھیرے سے دھکیلتی ہے ہر دروازے، ہر کھڑکی کو
خیر کی ضرب زمین کی

اس وقت اچانک بہت ساری جگہ ہوگئی ہے
کھلی اور خالی
لیکن جگہ نہیں ہے سنگ ساتھ کی، میل جول کی

بحث اور شوشرابے کی، لیکن پھر بھی
جگہ ہے: لفظ کی، نظم کی، خیر کو پڑھنے کو
ہم ابھی لفظوں میں، نظم کی سنسان راہداری سے
پکار رہے ہیں، گا رہے ہیں
زمین کی خیر ہو، زمین کی خیر ہو

زمین ہی دے سکتی ہے ہمیں
خیر اور عافیت
تمام قدیم نظاروں کو ڈھا کر
نئی ملائم روشنی
ہم زمین کے آگے سرنگوں ہیں

نظم

بند تالے کے اندر سے
ابھی ابھی نکلی ہیں وہ دو پتیاں
انھیں معلوم نہیں تھا کہ تالا بندی ہے
کچھ حیرت سے
کچھ بھولپن سے

دیکھا انھوں نے آکاش کو
بادل کو
ہوا کو
پرندوں کو

دھوپ کو
گھاس کو اور موسم کو

سب تھے اپنی اپنی لے میں
سب کا تھا اپنا جیون سنگت

نہیں تھا انسان کہیں
تھی صرف اس کے ناموجود ہونے کی کوئی کسک

پتیوں میں ہوئی ایک کپکپاہٹ
پر کچھ دیر میں وہ سہج ہو گئیں
جیسے سہج ہو جاتے ہیں بچے
بھول کر ساری احتیاج
کھو جاتے ہیں اپنی ہی دنیا میں

انسان کے بنا بھی کتنا سندر تھا یہ جہان

مختصر نظمیں

۱

صبح کی پہلی چڑیا بول رہی ہے
اب تک بچے اندھیرے کو چیرتی ہوئی
صبح کو پتا نہیں۔

۲

ویرانے میں آوازیں ہیں
الفاظ نہیں ہیں، لوگ نہیں ہیں
مقرر وقت پر پھر بھی ہو رہا ہے
سویرا۔

۳

چڑیا نے کچھ کہا نہیں ہے
اس کو کسی نے کچھ بتایا نہیں ہے
چپ چاپ چڑیا سویرا لے آئی ہے
اپنے ننھے ننھے پنکھوں پر

۴

شاید اندھیرے کو پتا ہوتا ہے
کہ اسے بیت جانا ہے
شاید روشنی کو خبر ہوتی ہے
کہ اس کا موقع آئے گا
شاید ہم ہی ہیں
جو بیتنے اور ہونے کے بیچ پھنسے ہیں۔

۵

ہمارے جانے بغیر کچھ کچھ چھوٹتا رہا ہے:
بچپن کے اولین عکس
رات کی ٹرین میں چپ چاپ کمبل اوڑھانے والے شخص کا چہرہ
صبح یاد نہ آنے والی راگ للت کی مشہور بندش
پچھلے برس سرس سے پٹے ڈھیر سارے پھولوں کا دن
کچھ کچھ چھوٹتا رہا ہے۔

ہوانگ باؤ
ترجمہ: آصف فرخی

شب بخیر

اے جلا وطن شاعر —
کیا حسین رات تمہاری ملکیت ہے؟
یہ پیاری رات جو صرف نو بیاہتا جوڑے ہی کہہ سکتے ہیں، تمہاری ہے؟
نہیں، چاندنی نہیں، پھول نہیں، راج ہنس نہیں،
میرے ہاتھوں میں بس بوندا باندی اور گھاس آتی ہے
اور اس سب کے باوجود، یہ بارش بھری رات
کیا بس تمہارے جان و دل کی ملکیت؟

ہاں، یہ سب میرا ہے۔
یہ نہ سمجھ لینا کہ میری محبت میں جراثیم پھیل گئے ہیں
میں ہوا سے طاقت ور عناصر لیتا ہوں، سورج سے کیلشیم،
میرے بال اور مونچھیں تیر کی طرح ہیں
مگر میری محبت رات کی طرح شرمائی ہوئی۔
تم جو مجھ سے بولے چلے جاتے ہو، بولے چلے جاتے ہو ساری رات
مہربانی کرو اور اپنے ہاتھ سے مجھے چھو لو
اپنی دس نازک انگلیوں سے چھو لو۔

ہوانگ خان
ترجمہ: آصف فرخی

جلاوطن کی واپسی

سورج نکلنے سے پہلے میں گھر لوٹ جانا چاہتا تھا...
دماغ کو بوکھلا دینے والی ان سڑکوں میں
اس دیہاتی قصبے میں جو بدتمیز نہیں لگتا۔

یہاں میں ایک زخمی سپاہی کی طرح ہوں، اپنے پیاروں سے دور،
اپنے زخموں کے ذریعے سے میں ان کی کمی محسوس کرتا ہوں
یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس پرانی، بنجر دھرتی سے محبت کرتا ہوں
یا آس پاس رقم کی طرح گردش کرتی تباہی سے محبت۔

میں بس ایک چیونٹی ہوں جسے خبر ہے کہ دھرتی کی درز کی بارش کے لیے
پیاس کیا ہے
میں قدموں کا نشان ہوں جسے لمبے سفر کا خوف نہیں
اس راستے پر جو پہلے ہی سے لمبا ہے
مجھے خبر ہے ابھی بہار نہیں آئی
اس وقت کھلنے والے پھول دھوکا ہیں۔
میں اپنے آپ کو واپس بھیج دینا چاہتا ہوں جیسے کوئی طاعون واپس بھیج دے۔
اپنے آبائی قصبے میں جہاں ایک کے بعد بیماریاں پھیلتی جاتی ہیں۔
میں تنہائی کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہتا ہوں

دوبارہ ملاپ کے لیے تڑپنا نہیں چاہتا
کہانیوں والے اس گوالے کی طرح جو کپڑا بننے والی لڑکی سے
جولائی کی ہر ساتویں تاریخ کو ملا کرتا تھا۔ میرے زخمی ہمدردی کے لیے نہیں۔

نیلیم کمار
ترجمہ: آصف فرخی

کورونا کے بیمار کی محبّت میں

وہ جب اٹلی سے واپس آئی
تو سانس لینے کے لیے ہانپ رہی تھی

وہ دو ہاتھ جو پڑھایا کرتے تھے
اٹلی کے طالب علموں کو ریاضی

وہ دو ہاتھ جو میں نے تھام لیے تھے
جس لمحے ہم ملے تھے

وہ دو ہاتھ جن کو ہم بھول گئے تھے
ملنے کے بعد کہ وہ ہاتھ کس کے ہیں

ان دو ہاتھوں نے مجھے چھونے سے منع کر دیا
میرے دو ہاتھ بھی ڈرے ہوئے تھے

ہمارے ہونٹوں نے ظاہر کیا
جیسے ایک دوسرے کے ہونٹوں کا کانپ جانا دیکھا ہی نہ ہو

وہ مجھے بحیرۂ عرب کے
ساحل پر بلا لائی۔ وہ کہا کرتی تھی

وہ سمندر کی موجیں، اپنے دل کی دھڑکنوں میں
لیے پھرتی ہے، وہ ہمیشہ

محبت کے مکالمے آغاز کرتی تھی
اپنے دل میں یہ موجیں لیے ہوئے

میں نے کہا ہم ایک گز کے فاصلے پر
بیٹھ جائیں گے، اس نے کہا ڈیڑھ

ہمیشہ ڈیڑھ گز، اس نے اصرار کیا
ریاضی اچھی چیز ہے۔ وہ اس میں ہوشیار تھی

ایک لفظ نہ ادا کیا ہم نے۔ ہماری آنکھیں
وہ سب کہتی رہیں جو ہم کہنا چاہتے تھے

ہمارے آنکھوں سے اُبلتے دریا دیکھ کر
بحیرۂ عرب بھی اداس ہوگیا۔

اس نے کہا، میں اب آخری دفعہ
تمہارے پاس آئی ہوں۔ پولیس کو بتا دیا ہے۔

(۲)

اسے اسپتال لے جایا گیا

جہاں صرف کردہ ۱۹۶ کے وائرس بول سکتے تھے

ان کے دکھالے موت کی جمع شدہ تعداد تھے
دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی لکھے جانے والے۔

اس نے اپنے دل کی دھڑکنیں گن لیں اور ہمارے بوسے
ہمارے چوری چھپے کے لمس اور بے خوابی

اس نے آکسیجن ٹینک سے باتیں کیں
اسے میرے نام سے پکارا

اسے معلوم تھا کہ کس شدت سے اس کی خاطر
میں وہ آکسیجن ٹینک بن جانا چاہتا تھا

(۳)

مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دن
وہ اسپتال کی سیڑھیوں سے نیچے آئی

میری نم آنکھیں دیکھ کر
اس نے پوچھا، سمندر ابھی تک وہاں ہے؟

میں نے کہا، تم میرا سمندر ہو
میری دھڑکنیں میری لہریں

پھر ہم تیزی سے بھاگتے ہوئے
سمندر کنارے تک گئے

اس کے دل میں خوف نہ تھا
اس کے دل میں سمندر کی نمی تھی

ہماری خوشی سے مٹ جانے کے انتظار میں
ساحل کی ریت پر

پولیس والوں کے بوٹ کے نشان
اور ڈیڑھ گز فاصلے کے اعلان تھے

اس ایک لمحے کے لمس میں
اس طویل ہم آغوشی میں

ہم نے دیکھا کہ ہمارے دل
ایک ہی جیسی لہروں کا جوار بھاٹا ہیں

ایک ہی جیسی لہروں کا جوار بھاٹا
اور واپس آنے سے ان کا انکار۔

گونیکیلو ایم-ٹیوریس
ترجمہ:ندیم اقبال

وبا کے دنوں کا روزنامچہ

۲۳ مارچ، ۲۰۲۰ء

ناسا قمری تحقیق منسوخ کر دیتی ہے۔
میٹیو اُس کھڑکی کے قریب کھڑا چمچ بھر پاستا کھاتا ہے
جہاں سے ویٹوریو ڈی سیکا اسٹریٹ صاف دکھائی دیتی ہے۔
سیکا 'بائیسکل تھیف' کا ہدایت کار تھا۔
لومبارڈی میں ایک عورت، پاؤلو نامی کسی شخص کو چیخ
چیخ کر پکار رہی ہے
لومبارڈی کے ایک ہسپتال میں ایک مریض، اپنے بھائی اور
بیوی کے چہرے آئی پیڈ پر دیکھتا ہے جسے ڈاکٹر کے سفید
دستانے والے ہاتھوں نے ہوا میں اُٹھا رکھا ہے۔
میریٹ ہوٹل کو ایک جنگی ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔
پُرتعیش کمرے کو اب دس افراد کے لئے ایک کمرا بنا دیا گیا ہے۔
اُس تمام جگہ کو استعمال میں لے لیا گیا ہے اور اسے مشینوں،
بیمار لوگوں اور ڈاکٹروں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے۔
ایک فوری اور نئی کاشت کاری نے بیمار لوگوں اور وینٹی لیٹرز کا
ڈول ڈالا ہے۔

ملازمت سے سبک دوش کیے گئے لوگوں کی انجمن کے صدر نئی نسل
کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ اس موقع پر انہیں فراموش نہ کریں۔
اپنے والدین اور والدین کے والدین کو بھول نہ جائیں۔
میرے برابر بیٹھی ایک لڑکی رو رہی ہے۔
ایک وزیر نے اقدامات کی بات کی تھی، ایسے اقدامات جن کی
اہمیت جاننے اور اُن کا جائزہ لینے سے وہ قاصر تھا۔
آندریوتی، عمر ساٹھ سال، چہرے پر ماسک، ایک ننھے مُنّے کتے کو
ایک لمبی رسی گلے میں باندھے، ٹہلاتا ہے۔
فرانس میں اموات ۱۸۶۔
میری بیلجیئن شیپرڈ کتیا کا نام روما ہے۔
روما صحیح سلامت اور زندہ ہے اور اپنی دُم ہلاتی ہے۔
وہ اُٹھ کر کھڑی ہوتی ہے تو کسی سیاہ ریچھ جیسی دکھائی دیتی ہے۔
میں روما کو سینے سے لگا کر بھینچ لیتا ہوں۔
روما روتی نہیں ہے لیکن وہ خوش نہیں ہے۔
میں اُس سے کہتا ہوں: روما مت روؤ۔
تھرمامیٹر، بخار ۳۷٫۲۔
میں اسٹاک مارکیٹ والا گیم کھیل رہا ہوں جسے اکیلا آدمی کھیل سکتا ہے۔
بخار، کبھی تیز ہو جاتا ہے، کبھی اُتر جاتا ہے۔
وہ کہتے ہیں کہ ایران میں مارے گئے افراد کی قبریں خلا سے دیکھی جا سکتی ہیں
عظیم دیوارِ چین، اجتماعی قبریں۔
منحصر اس پر ہے کہ کتنی بلندی ہے۔
آپ کتنی بلندی پر جانے کی ہمت کر سکتے ہیں تاکہ دیکھ سکیں۔
بخار، ۳۷٫۲۔
ہر ایک ملک کے لیے ایک بخار۔
ایک حیاتیاتی بخار نہ کہ بیرونی بخار۔

انسان نمبر ۲ کو انتہائی تیز بخار ہے۔
انسان نمبر ۳ برقی تختی پر سب سے پرانا گیم کھیل رہا ہے: دیوار پر گیندیں مارنا
بیرون خانہ، کھیل کود کے مقابلے عارضی طور پر منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔
ایک ہولناک اسکور بورڈ ایک واحد عدد کا اعلان کر رہا ہے جس کا اب کوئی فریق
مخالف نہیں ہے۔
ہر ملک کا ایک واحد عدد۔
ایران: ۱۲۷۔
روما پیاسی ہے، میں پیالے میں پانی بھر دیتا ہوں۔
ہاتھ کپکپاتا ہے، بچے ثابت قدم ہیں
دنیا کے خاتمے کا اعلان ہمیشہ سے، اعداد و شمار کے طور پر ہی کیا گیا ہے۔
کارل پیئرسن نے ۱۹۰۱ میں 'بائیومیٹریکا' نامی جرنل کی بنیاد رکھی تھی۔
صدی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب اشیاء کے ناپنے کا عمل ضروری ہو جاتا ہے۔
عمودی سمت ناپو، اُفقی سمت ناپو، پیر کا ناپ لو، ناک کا، ایک دل کا۔
بڑے اعداد صدیوں کے آغاز ہی سے ایک میلان کا اعلان کرتے چلے آئے ہیں۔
مارتھا کہتی ہے کہ اس کی نانی خیریت سے ہے مگر فون رکھنے سے پہلے ہی رونا شروع کر دیتی ہے
۲۰۲۰ میں ایک اور صدی کا آغاز ہوتا ہے۔
مارتھا کہتی ہے کہ وہ فون رکھنے کے باوجود نانی کے رونے کی آواز سُن سکتی ہے۔
ایسا ناممکن ہے، میں کہتا ہوں۔
ایسا ممکن ہے، وہ کہتی ہے۔
دو دن پہلے کی خبریں:
''اطالوی معیشت کو پہلی سہ ماہی میں بڑا دھچکا''
''افریقہ کے ۳۸ ممالک اور ملحقہ علاقوں میں ۹۰۰ سے زائد کیسز سامنے آئے ہیں''
''ملازمین کے جراثیم سے متاثر ہونے کے بعد چار فارمیسی بند کر دی گئیں۔''
ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے ڈائریکٹر جنرل نوجوانوں کو متنبہ کرتے ہیں: ''تم ناقابل تسخیر نہیں
ہو'' اور یہ کہ شائد اُنہیں ''ہفتوں ہسپتال میں گذارنے پڑیں یا پھر وہ مر بھی سکتے ہیں۔''

گیوٹو بیس برس کا ہے اور جب یہ سُنتا ہے تو رُک جاتا ہے۔
میں تصور میں اِن الفاظ کو بے شمار مرتبہ لاؤڈ اسپیکر پر دُہرائے جاتے ہوئے سُنتا ہوں:
تم نا قابلِ تسخیر نہیں ہو۔
''ریاست ہائے متحدہ ملک میں داخلے کے پروانے منسوخ کر دیتا ہے۔''
اطالوی شہروں میں آپ، لاؤڈ اسپیکروں سے سُن سکتے ہیں: تم نا قابلِ تسخیر نہیں ہو۔
سیلین بیان کرتی ہے کہ کس طرح برلن پر بمباری کے عین درمیان ایک پاگل عورت
راہ چلتے لوگوں کے کان کے قریب جا کر زور سے بَم کی آواز نکالتی تھی بووووم۔
ایک ایسی چیز کی آواز جو بغیر کوئی آواز نکالے، جان سے مار دیتی ہے۔
''اسٹینڈرڈ اینڈ پُوئر، ٹی اے پی کے درجے میں تنزلی کر دیتا ہے''
''جکارتہ میں حکام، ہنگامی حالت کا اعلان کر دیتے ہیں۔''
ایک جرثومے کی آواز۔
''ساؤ پاؤلو میں ساٹھ سال سے زائد عمر کے افراد پر پُرہجوم اوقات میں پبلک ٹرانسپورٹ
میں سفر کرنے پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔''
اسپین میں اموات ۴۶۲۔
روما پیالے سے پانی پیتی ہے، وہ پیاسی لگتی ہے یا پھر وہ ایک اُونٹ میں تبدیل ہو رہی ہے:
وہ آنے والے دُشوار دنوں کے لئے پانی ڈھکوس رہی ہے۔
صدی کا اختتام اور بڑے بڑے اعداد۔
ناگہانی آفات اور تباہی کا لینا دینا اعداد و شمار سے ہے، اُس شخص سے کوئی لینا دینا نہیں ہے
جو تمہارے برابر میں بیٹھا ہوا اعداد و شمار پر نظر ڈال رہا ہے۔
''مجھے ٹی وی یاد آتا ہے'' فوسٹر وَیلس کا ایک کردار کہتا ہے۔
''تم نے ترک کرنا سکھ لیا ہے'' فوسٹر وَیلس کا ایک اور کردار کہتا ہے۔
اٹلی میں اموات کی تعداد ۶۰۱۔
وہ کہتے ہیں کہ باریک اور مہین ترین ذرّات مثلاً جرثومہ، ایٹم وغیرہ بھی آواز نکالتے ہیں۔
جب وہ کسی چیز سے ٹکراتے ہیں تو ایک آواز نکلتی ہے۔
جرثومے کی آواز۔

تصور کر رہا ہوں کہ ماہرین باہر گلی میں جرثومے کی آواز کا کھوج لگا رہے ہیں۔
اُس کو ہلاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اُس کی سُریلی آواز سُنی جائے۔
۶۰۱، ۶۰۱، ۶۰۱۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اٹلی میں مرنے والوں کی تعداد۔
میں کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں، سب کچھ خالی، سونا، ویران:
اُوپر اونچائی پر، نیچے زمین کی طرف، دور فاصلے تک۔
نیرودا کی ایک سطر۔
''ایک راستے پر چلتے/ ہوا سے ملاقات ہوگئی۔''
ایک اطالوی عورت کہتی ہے کہ یورپ نے اٹلی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔
میں ٹی وی بند کر دیتا ہوں۔

۲۴ مارچ

بوریت محسوس کر رہے ہو؟
یہ لو، یہ وہ گانے ہیں جو وبا کے دنوں میں تمھیں رقص کرنے پر مجبور کر دیں گے
کل کینی روجرز مر گیا۔
کل اُڈرزو دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔
''ریوڈی جنیرو کے پسماندہ شہری علاقے کورونا وائرس کا مقابلہ کرنے کے لیے بنیادی وسائل کی کمی کا شکار ہیں۔''
'عالمی وبا کے اس دور کے بارے میں ستارے ہمیں کیا بتا رہے ہیں'
میں ایسٹیرکس سپاہی کو یاد کرتا ہوں۔
اوبیلکس مُصر تھا: اُس کی فوجی وردی درمیانے ناپ کی ہونی چاہیے۔
درمیانی، درمیانی راستے پر چلتے ہوئے
باہر گلی میں لوگ درمیانی راستے پر چلتے ہیں۔
وہ کاروں اور عمارتوں سے ایک فاصلہ رکھ کر چلتے ہیں۔
درمیانی راستے پر، یہ کوشش کرتے ہوئے کہ کسی چیز کو نہ چھوئیں۔

تل ابیب اور یروشلم میں اطالوی پرچم کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔
ٹورنٹو میں اطالوی پرچم کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔
ریوڈی جنیرو میں، نجات دہندہ یسوع کے مجسمے پر اطالوی پرچم کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔
علی الصبح جوتے پہن کر یہ فرض کر لیا ہے کہ تم باہر کہیں سیر کرنے جا رہے ہو۔
ہسپتال کے اندر، ایپرن میں ملبوس ایک ڈاکٹر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بات کرتی ہے تاکہ اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند کر سکے۔
اسٹریچروں، ڈاکٹروں اور بیمار لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے۔
وہ اطالوی ترانہ لگا دیتی ہے۔
اٹلی کو تم پر فخر ہے!
اپنے ایپرن اور ماسک پہنے وہ ڈاکٹر چلاتی ہے۔
بالکل کسی فٹ بال کوچ کی طرح، لیکن ایک المیے کے درمیان نہ کہ کسی میچ کے بیچ۔
پیرس کے ڈرون لوگوں کو گھر میں رہنے کے لئے کہتے ہیں۔
ایک ڈاکٹر سے رابطے میں آنے کے بعد جو کہ متعدی مرض کا شکار تھا، انجیلا مرکل قرنطینہ میں چلی جاتی ہے۔
ٹرمپ کہتا ہے کہ امریکیوں کا حقیقی جذبہ انہیں گھر بیٹھنے کی اجازت نہیں دے گا۔
فورڈ، کاریں بنانے کی بجائے، ایمرجنسی طب کے لئے مشینیں بنا رہا ہے۔
تیز رفتاری کے لئے مشینوں کے بجائے تحفظ، بچاؤ اور عافیت کے لئے مشینیں۔
میں بیمار کے بستر کے برابر ایک کار انجن کا تصور کر رہا ہوں۔
دو متضاد دنیائیں۔
ایک رفتار جو کسی نے نہیں مانگی۔
ایک ناموزوں انجن۔
مجھے اس رفتار کی ضرورت نہیں، ایک بیمار آدمی کہتا ہے۔
میں نے ایک سیاہ جیکٹ پہن رکھی ہے جس کی زپ اوپر تک بند رکھی ہے یوں میں اپنے گلے کی حفاظت کر رہا ہوں۔
پس منظر میں ناحق دھیان بٹانے والا ایک لیموں کا درخت، زرد، کڑوے پھل۔

زرد کی حفاظت کی جانی چاہیے۔
مَسَرت بخش رنگوں کو آئینی تحفظ حاصل ہے۔
ہمیں چاہیے کہ بستر کی شکنوں کو ٹھیک کر دیں اور یہ تصور کر لیں کہ ہم دن کے دوران
کہیں بہت دور چلے گئے ہیں۔
بستر نہیں سمجھتا کہ ہم اُسے دھوکہ دے رہے ہیں۔
ہم تو تمام دن وہیں ہیں، پکّھ گز پرے۔
فرنیچر کو، دروازے کو دھوکہ دیتے ہوئے۔
یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ ہم باہر جا رہے ہیں، بار بار دروازے کو کھول رہے ہیں۔
بند کر رہے ہیں۔
ایک بھولا بھولا دروازہ، کسی بھی بات کا یقین کر لے گا۔
چین میں، ریاست ہر شہری کے درجۂ حرارت پر نظر رکھتی ہے۔
سینتیس ڈگری سے زیادہ: ایک خطرناک شہری۔
دھوکہ دہی کا لفظ زبان سے خارج ہو کر حیاتیات میں چلا گیا ہے۔
بیمار ہو جانا، ریاست کے لیے ایک خطرہ ہے۔
کوئی بھی بیمار شخص فوراً ایک غیر ملکی شخص بن جاتا ہے۔
اگر تم ایک صحت مند شخص ہو تو تم میری قوم میں سے ہو: اگر تم بیمار ہو تو کوئی اور زبان بولتے ہو۔
صحت مند کی زبان، بیمار کی زبان۔
بالآخر بیماروں کو غدّاری کے جُرم میں گولیاں ماری جا رہی ہیں۔
معیار بدلتا ہے، قانون بدل جاتا ہے۔
اطالوی چیمبر کا صدر دونوں ہاتھ جوڑ کر لوگوں سے کہتا ہے کہ وہ اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔
ایسا لگتا ہے کہ وہ عبادت کر رہا ہے، بخشش اور رحم کی دعا بھی اور حکم بھی دے رہا ہے، یہ
سب بیک وقت۔
ایک اطالوی ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کیوں ہیئر ڈریسر گھروں
جا کر خواتین کی زُلفیں تراش رہے ہیں۔
وہ کہتا ہے کہ تابوت بند رکھے جا رہے ہیں، کوئی بھی اُن کے بالوں کی وضع قطع نہیں دیکھ

سکے گا۔
اُس کا یہ کہنے کا انداز بہت اذیت ناک ہے۔
میں خاموش ہو جاتا ہوں۔
اور خاموش ہی رہتا ہوں۔

۲۶ مارچ

ماسکو میں چیکووسکی کنسرٹ ہال گزشتہ کئی دنوں سے خالی پڑا ہے۔
پوپ فرانس کا کرونا وائرس ٹیسٹ نگیٹو آیا ہے۔
میرا قیاس ہے کہ کچھ گرجاؤں میں دعائیہ نغموں کی ریکارڈنگ دوبارہ سے لاطینی زبان میں ہو رہی ہے۔
واپس پلٹنا، ضروری ہے۔
یورپ میں لوگ اپنی زبان دروازے کے باہر چھوڑ رہے ہیں۔
وہ اپنی گذشتہ زبان سے دست بردار ہو رہے ہیں اور کوئی دوسری زبان بولنا شروع کر رہے ہیں لاطینی کو اپنانے کا بھی اختیار ہے۔
ہم چیخ بھی سکتے ہیں۔
چھیانوے سالہ خاتون شفایاب ہوگئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مرنے والی نہیں ہے۔
ماسکو کے چیکووسکی کنسرٹ ہال میں انہیں پیانو تو لازماً اسٹیج سے ہٹانا پڑے گا۔
برابر والے گھر میں، ماؤ چاؤ: مجھے ہوائی جہاز پسند ہیں، مجھے تم پسند ہو۔'
'مجھے سفر کرنا اچھا لگتا ہے، مجھے تم اچھے لگتے ہو۔'
ایک سر کے لئے خوفزدہ ہونا ممکن ہے مگر پیروں کے لئے نہیں۔
بولسونارو کہتا ہے کہ سپر مارکیٹوں کی طرح گرجا گھروں کو بھی کھلا رہنا چاہیئے۔
سپاہی ریٹائرمینٹ ہومز میں جراثیم کش اسپرے کر رہے ہیں۔

تمام یورپ میں بوڑھے مُردوں کو فوجی ٹرکوں سے مخصوص جگہوں پر بھیجا جا رہا ہے۔ تمہیں وقتاً فوقتاً کھڑکی کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ہوا جب رُک جاتی ہے تو بہت ٹھوس اور بوجھل ہو جاتی ہے۔

بظاہر کچھ فضول اور لاحاصل دعوتیں منسوخ کر دی گئی ہیں۔

مانو چاؤ: 'مجھے چرس پسند ہے، مجھے تم پسند ہو۔

میں ایڑیوں کے بل گھومتا ہوں تا کہ یہ ظاہر کرسکوں کہ میں بہت چل پھر رہا ہوں۔

اخبارات میں، جنسی ملاقاتوں کے اشتہارات کے صفحوں پر کمی کر دی گئی ہے۔

جنسی جذبات ابھارنے والی تمام تصاویر پرانی ہیں۔

ہمارے پاس یہ تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لیے دو مہینے ہیں کہ اہم کیا ہے۔

وہ کوئی اشتباہ ہونا چاہیے۔

وہ کہتے ہیں کہ حُسن کی تزئین و آرائش کی مصنوعات کے آن لائن آرڈر بہت بڑھ گئے ہیں۔

ایسی بھی خبریں ہیں جو میرے ذہن میں ظاہر ہوتی ہیں۔

ماسکو میں ریستوراں، دکانیں اور پارک بند کر دیے گئے ہیں۔

ایران میں اموات ایک سو ستاون۔

اسپین میں اموات چار ہزار سے آگے نکل گئیں۔

میں اپنی کُتیا روما کو کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا سکھاتا ہوں۔

ایسا لگتا ہے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو: تم بے وقوف ہو۔

الیاس کانیتی: ''ہر وہ چیز جو میں سیکھتا ہوں اُسے میں خوف میں تبدیل کر دیتا ہوں'۔ انتظار کرنا سیکھ رہا ہوں جیسے انتظار کرنا بھی واقعی کوئی کام کرنا ہو۔

اخباروں کے آن لائن صفحات کی ورق گردانی کرتا ہوں جو وضاحت سے سمجھاتے ہیں کہ باہر سے آنے کے بعد جوتوں کو جراثیم سے کیسے پاک کیا جائے۔

اسپین ۴۹۸، فرانس ۳۶۵، ایران ۱۵۷، اٹلی ۱۲۷۔

'آدمی نے رقیب کو شراب خانے کے صحن میں دو گولیاں مار کر ختم کر ڈالا'۔

کارتوس ابھی متروک نہیں ہوئے۔

'نیو یارک اسٹاک ایکسچینج اوپر جاتا ہے'۔

انقلاب فرانس کے دنوں میں بہت سے لوگوں نے وقت بتانے والے گھنٹوں پر گولیاں
چلانا شروع کر دی تھیں۔
میں اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں، میں غسل رتا ہوں۔
گھڑی کی گردن کی پشت پر ایک گولی مارو۔
ایک گولی گھڑی کے چہرے پر۔
جری، گولڈن ریٹریور، کی آنکھوں میں اداسی ہے۔
روما، ایلجین شیپرڈ، کی آنکھوں میں حیرت ہے۔
وہ ہمیشہ متعجب رہتی ہے۔
باہر سورج نکلا ہے۔
'اپنی گھڑیاں دوبارہ ملانا نہ بھولیں۔ اس اتوار سے گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے ہو جائیں گی۔'
سڑک پر چلتے آدمیوں کی آنکھوں میں حیرت ہے۔
ہم سب متعجب ہیں۔
میں تصور میں سرکاری ملازمین کو عوامی گھڑیوں پر گولیاں چلاتے دیکھتا ہوں۔
سیدھے، صاف نشانے پر چلائی گئی گولی، جو وقت کو روک دے۔
گویا وقت شکار کرنے لائق کوئی جانور ہے۔
'مراکانہ کو ایک ہسپتال میں تبدیل کیا جائے گا تاکہ وہاں بیماروں کو داخل کیا جاسکے۔'
امریکہ ۱۱۹، جرمنی ۳۳، پرتگال ۱۷، برطانیہ ۱۱۵۔
ایک دوست مجھے فون پر کہتی ہے: اب میرے لیے کسی پر گولی چلانا ضروری ہو گیا ہے۔
میں اسے گھڑیوں، گھنٹوں کی کہانی سناتا ہوں۔
متعجب نظریں لیے انسانوں کی نسل۔
انسان حیرت زدہ۔
اکیسویں صدی کو اک جرثومے نے دولخت کر دیا۔
اس صدی میں، دو صدیاں ہیں۔

۲۷ مارچ

میں اپنی ایڑیاں اوپر اٹھاتا ہوں اور پھر پیروں کی انگلیاں۔
گریمیو۔ فلیمنگو کا فٹ بال میچ۔
'جوڑوں کے درد کے ساتھ زندگی گزارنا ترک کریں۔'
ٹیلی وژن پر ٹیلی شاپنگ۔
میں بٹن دباتا ہوں۔
'انسانیت کے لیے پوپ کی دعا۔'

چینل ا۔

ویٹیکن اسکوائر خالی
پوپ ایک عظیم، وسیع وعریض اور خالی جگہ سے خطاب فرمارہے ہیں۔
مجھے بہت سارے گھروں سے، لوگوں کے گھٹنوں کے بل جھکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔
کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں آپ کبھی سن پاتے ہیں اور کبھی نہیں۔
آج کل آپ سب کچھ سن سکتے ہیں۔
حتیٰ کہ کئی کلومیٹر دور کسی کے گھٹنوں کے بل جھکنے کی آواز بھی۔
سینٹ پیٹرز کے کلیسا میں گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں۔
گھنٹیاں بجانے کا فن، ہاتھوں کا فن، قوت کو قابو میں رکھنے کا فن۔
وہ گھنٹیاں جو کسی بھی میکانکی عمل کے ذریعے بجنے سے انکار کردیتی ہیں۔
انسانی دھات کی گھنٹیاں۔
مگر ان دنوں، اکثر اوقات یہ مشینیں ہی ہیں اور اپنے مقام پر موجود رہی ہیں اور بغیر کسی
خوف ودہشت کے، اپنا فرض نبھاتی رہی ہیں۔
کبھی کبھی ہمیں مشینوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے۔
وہ اپنے مقام پر ٹھہری رہتی ہیں۔

کسی نے مجھ سے کہا کہ گھنٹیاں بجانے کے لیے کوئی بھی موجود نہ تھا۔
صرف مشینیں۔
آڈن:]-----[وہ ہیں، اور اسی لیے دُکھ اٹھاتے ہیں: وہ صرف یہی کچھ کرتے ہیں۔

کارٹون، چینل ۲۔

ایوننگ شو: آپ کا اس سب کے بارے میں کیا خیال ہے؟
کوئی کسی سے پوچھتا ہے۔
مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس بارے میں بات کر رہے تھے لیکن اُن میں سے ایک جواب دیتا ہے اور دوسرا سنتا ہے۔
اطلاعات کے چینلز: ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ میں گنتی روک دیتا ہوں۔
برگامو، ایک شہر جو بھیانک انداز سے لپیٹ میں آیا ہے
ہماری مدد کرو، برگامو کے ایک اسپتال کا ڈائریکٹر التجا کرتا ہے۔
فرانس میں ایک تیرہ سالہ لڑکی مرتی ہے۔
فرانس کی پرتعیش عطر ساز صنعت، حفاظتی الکحل بنا رہی ہے
کوئی خوشبو، اس انسان کی خوشبو سے بہتر نہیں جو زندہ ہے۔
چار نرسیں اسپتال کے دروازے سے ایک جسم کو اپنے شانوں پر اٹھا کر وارڈ میں منتقل کرتی ہیں۔ ایک بیمار شخص، وہ ابھی زندہ ہے۔
ریاست ہائے متحدہ میں ہزار ہا لوگ اس جراثیم سے متاثر ہوئے ہیں۔
لاری ڈرائیور، ایک اُجاڑ سنسان یورپ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سفر کر رہے ہیں۔
ایک پروگرام ایسے کتوں کے متعلق آ رہا ہے جو کسی گھر نہیں جا سکتے کیونکہ ابھی اُن کے پاس وہ کاغذات نہیں ہیں جو انہیں گود لینے، اپنانے کے لیے ضروری ہیں۔
ذہنی مسائل کا شکار کتے، دسراہٹ کی کمی۔
ٹانگ ٹوٹے کتے، کتوں کی ٹانگوں کے ایکسرے۔

پھیپھڑوں کے بے شمار ایکسرے دیکھنے کے بعد، کتوں کی ٹانگوں یا لوگوں کی ٹانگوں کے ایکسرے دیکھنا کتنا عجیب لگتا ہے۔

ان دنوں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ انسانی جسم میں صرف پھیپھڑے ہی ہیں۔

ہم بقیہ جسم کی موجودگی سے بھونچکارہ جاتے ہیں۔

یہ کسی حملے جیسا ہے، عزت نفس کو ٹھیس پہنچانے جیسا۔

ٹی وی، اگلا چینل غالب۔

جزیرۂ محبت نامی ایک ٹی وی پروگرام جس میں تیراکی کے لباس میں ملبوس مرد اور خواتین جن کے جسموں پر نقش ونگار گدے ہوئے ہوتے ہیں بظاہر ایک بچے کی دیکھ بھال کرتے ہیں جو حقیقت میں ایک گڑیا ہے۔

یہ گڑیا جو ایک بچے کی نقل اتارتی ہے اور روتی ہے، مجھے یقین ہے کہ ہر گٹھیلے جسم والے جوڑے کو اس بات کے نمبر دیے جاتے ہیں کہ وہ اس سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔

کووڈ ۱۹، ایک چینل پر بے یقینی اور تذبذب: غسل کیسے کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی بیمار شخص سے فاصلہ کیوں کر برقرار رکھا جائے جو کہ ملنے جلنے سے معذور ہے۔

پچاس عمر رسیدہ لوگوں کو اولڈ ہوم سے ایک ہوٹل منتقل کر دیا گیا ہے۔

یہ رہا ایورٹن، دیکھتے ہیں یہ کیا تیر مارتا ہے۔ گریمیو۔ فلیمنگو آنکھوں دیکھا حال۔

ایک پرانے میچ کی ریکارڈنگ دکھائی جا رہی ہے۔

میں نے نہیں دیکھا کہ ایورٹن نے کیا کیا۔

میں ایک سیب لانے کے لیے اٹھتا ہوں۔

ایک چاقو، ایک سیب، اردگرد ایک سیاہ ہالہ۔

ہمیں کچھ کھانا چاہیے۔

اٹلی میں، ایک لڑکی ایک سیب پر یوں پھونک مارتی ہے جیسے کیک پر لگی موم بتیوں کو بجھا رہی ہو، وہ جرثومے کو بھگانے کے لیے پھونک مارتی ہے۔

ایک رسم ہے۔

ایک سیب کھانا، علامتی طور پر ایک سالگرہ منانا ہے۔

سالگرہیں روز منائی جاتی ہیں۔

آڈن: 'یہاں جنگ کسی یادگار جیسی سادہ ہے۔'
ایک دوسرے مجھے ٹیکسٹ بھیجتا ہے۔ وہ میرے فرشتے کی بابت پوچھتا ہے۔'
میرے لباس کا فرشتہ۔
میں اُسے جواب دیتا ہوں کہ میں نے اسے کئی دنوں سے نہیں دیکھا۔
وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

۲۸ مارچ

والٹر بنجمن نے لکھا تھا 'مسلسل تباہی کے سامنے چھوٹے چھوٹے شگافوں اور دراڑوں کو مضبوطی سے تھامے رہنے میں تحفظ اور عافیت ہے۔'
عافیت کو لازم ہے کہ وہ ان مختصر وقفوں، اور لمحوں میں آئے۔
جب شیطان کی توجہ ایک لمحے کے لیے کسی اور جانب ہو، تبھی وہاں دراڑ بنتی ہے۔
اور وہی وہ جگہ ہے جہاں سے تحفظ اور عافیت اندر آتی ہے۔
اسپین۔
چھبیس مارچ، ڈیل مار ہسپتال کی چوتھی منزل، کمرہ نمبر ۴۲۹ میں۔'
ایک وڈیو۔
ڈیل مار ہسپتال میں ایک نرس اپنا سیل فون اٹھاتی ہے اور ایک انتہائی بیمار شخص کے بیٹے کو فون کرتی ہے۔
چوتھی منزل، کمرہ نمبر ۴۲۹۔
وہ ویڈیو کال کرتی ہے، فون کا رُخ بوڑھے، بیمار شخص کے چہرے کی طرف کر دیتی ہے۔
'جی ہاں' وہ آرام سے سانس لے رہا ہے، مشین کے بغیر، وہ بستر پر پڑے بیمار شخص کے بیٹے کو بتاتی ہے۔
پھر وہ مسکراتے ہوئے دُہراتی ہے 'کیا تمھیں نظر نہیں آ رہا؟ کیا تمھیں دکھائی نہیں دے رہا؟'
وہ یہ دکھانا چاہتی ہے کہ اُس کا باپ اب اتنا بیمار نہیں ہے، اور یہ کہ وہ اب بہتر ہو گیا ہے۔

وہ دُہراتی ہے: وہ مشین کے بغیر سانس لے رہا ہے، اس نے صرف ماسک پہنا ہوا ہے!
وہ ایسے بات کرتی ہے گویا کسی باپ کو یہ خبر دے رہی ہو کہ ابھی ابھی اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔
لیکن ایسا نہیں ہے۔
وہ ایک بیٹے کو یہ خبر دے رہی ہے کہ اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔
بیمار شخص اپنے بیٹے کی شکل کی طرف اپنا ہاتھ بلند کرتا ہے۔
نرس سیل فون کو مزید قریب لے آتی ہے۔
بیمار شخص کا ہاتھ اسکرین سے محض چند سینٹی میٹر دور ہے۔
اسکرین پر اپنے بیٹے کا چہرہ چھونا، آج کل، بیٹے کا چہرہ چُھونا ہے۔
اسکرین کو تقریباً چُھو لینا جسم کو چُھو لینا ہے۔
ہیلو! میں سوسانہ ہوں، نرس اسکرین کے دوسری جانب بیٹے سے خوشی سے مخاطب ہوتی ہے۔
ہمیں ایسی خوشی کی ضرورت ہے جو چھوٹی چھوٹی درزوں اور شگافوں میں داخل ہو سکے۔
گویا خوشی کوئی طبّی ساز و سامان ہے۔
تقریباً ایک ایسا مادہ جو تحفظ اور عافیت ہے۔
کچھ ایسی نرسیں ہیں جو یہ مادّہ استعمال کرتی ہیں۔
کتنا اچھا ہوا، حوزے، نرس کہتی ہے۔ تم نے اپنے بیٹے کو دیکھ لیا۔
جو شخص اس سب کی فلم بندی کر رہا ہے وہ بیمار شخص حوزے کا ساتھی ہے۔
اور اسی کمرے میں اس کے ساتھ داخل ہے۔
وہ شخص جو ایک اور بیمار شخص کی فلمبندی کر رہا تھا فلمبندی ختم کر کے تھکی ہوئی آواز کہتا ہے:
'ہر ایک کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں'
کوئی شخص جو خود بیمار ہے وہ دوسرے لوگوں کی خوشی کے متعلق بات کر رہا ہے۔
کوئی شخص جو خود بیمار ہے وہ موضوع بدل دینے پر قدرت رکھتا ہے۔
میں وہ موضوع نہیں ہوں، ہسپتال کے بستر پر پڑا ایک شخص جو دوسروں کو خوشیوں کی دعائیں دیتا ہے، کہتا ہے۔
کچھ ایسے شگاف اور درزیں ہیں جو عیاں ہیں اور مستقل تباہی اور آفتِ ناگہانی میں بھی

خوبصورت ہیں۔
ہجمن ایک ضروری تحقیقات کے متعلق بات کرتا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ عافیت اور نجات کی
حدود کے دو نام ہیں: بہت جلدی اور بہت دیر۔
میں لکھتا ہوں۔
بہت جلدی اور بہت دیر کے درمیان جو کچھ ہے وہ عافیت ہے۔
عافیت کا وجود اسی وقت تک ہے جب تک وہ بروقت نشانے لگانے کا ایک اثر ہو۔
کسی حرکت کرتے نشانے کی طرح وقت پر نشانہ لگانے کی دو بیرونی حدود ہیں:

بہت جلدی اور بہت دیر
ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ پلیگ ایک شگاف، درز یا جھری نہیں ہے۔
جس کی مرمت باآسانی کی جاسکے۔
خوشی کافی نہیں لیکن یہ ضروری ہے۔
خوشی شائد بچالے، یہ کوئی مشین بھی ہوسکتی ہے جو کسی شخص، کو جو سانس لینے سے معذور ہے،
سانس لینے میں مدد کردے۔
ایک مشین خوشی نہیں دے سکتی۔
شائد دے سکتی ہے، لیکن بلاواسطہ نہیں۔
ایک مشین جس کا کام ہے کہ وہ بیماری کے شگاف، جھری یا درز میں ایک عظیم یا کم ازکم
معمولی سی خوشی بھر دے۔
ایسی مشینوں کا آرڈر دینا جو ابھی بنی ہی نہیں ہیں اور وہ بھی ایسی
فیکٹریوں سے جو ابھی وجود ہی نہیں رکھتی ہیں۔
میں لارپبلیکا پڑھتا ہوں اور بے اختیار کانپ اٹھتا ہوں
میں الفاظ کو بلند آواز میں دُہراتا ہوں۔
الفاظ کو بلند آواز سے دہرا رہا ہوں حتیٰ کہ وہ ہوا میں غائب ہوجائیں۔
گویا کبھی وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔
الفاظ کو سو مرتبہ دُہرا رہا ہوں تاکہ وہ غائب ہوجائیں۔
گویا بار بار استعمال بھی الفاظ اور اشیاء کو تباہ کرنے کا ایک طریقہ ہو۔

لارپبلیکا میں لکھا ہے کہ لومبارڈی میں اب کوئی دادا، دادی، نانا، نانی باقی نہیں بچے۔
یہ وہ الفاظ ہیں۔
انہیں لازماً اتنی بار دُہرایا جائے کہ وہ ہوا میں غائب ہو جائیں۔
ان الفاظ کو فرش کے تختوں کے نیچے چھپا دو یا پھر اتنی مرتبہ دُہراؤ کہ وہ ہوا میں غائب ہو جائیں۔
لارپبلیکا میں وہ کہہ رہے ہیں کہ لومبارڈی میں اب کوئی دادا، دادی، نانا، نانی باقی نہیں بچے۔

۳۰ مارچ

ایک یونانی دوست مجھے ایک ای میل بھیجتی ہے۔
ΠΑΤΕΡΑΣ یونانی میں باپ کو کہتے ہیں۔
وہ کہتی ہے: یونان میں گھر سے باہر جانے کے لیے ہمیں 13033 پر ایک ٹیکسٹ بھیجنا پڑتا ہے جس میں گھر سے باہر جانے کا مقصد بیان کرنا پڑتا ہے۔
لکھو اس طرح: '۴ اتھنیا اسپارئ ایڈریس'
اتھنیا اسپارئ اُس کا نام ہے۔
وہ آغاز میں دیے گئے نمبر کی وضاحت کرتی ہے۔
ہر نمبر گھر سے باہر جانے کے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔
1۔ ڈاکٹر یا میڈیکل اسٹور جانے کے لئے۔
2۔ انتہائی ضروری اشیاء مثلاً کھانے پینے کی چیزیں جب ہوم ڈلیوری ممکن نہ ہو۔
3۔ بینک جانا، وہ جن کے لیے ای۔ بینکنگ ممکن نہیں
4۔ خصوصی ضروریات کے حامل افراد کی ضروریات کے لیے
5۔ کس تقریب میں شرکت مثلاً تدفین، شادی، بپتسمہ (ہمیشہ پابندیوں کے اطلاق کے ساتھ)
6۔ طلاق یافتہ علیحدگی شدہ والدین کے لئے تا کہ وہ اپنے بچوں سے ملاقات کر سکیں۔
7۔ کھلی ہوا میں جسمانی ورزش یا پالتو جانور ٹہلانے کے لئے (پابندی کا اطلاق ہوگا)
یعنی صرف گھر کے آس پاس۔

گزشتہ روز میری یونانی دوست نے یونانی حکومت کو یہ ٹیکسٹ بھیجا:

Αθήνα Αθηνά Σπύρη Αλκμάνος 124

نمبر 4 کا مطلب ہے کہ وہ باہر کسی کی مدد کرنے جا رہی ہے۔

Αθήνα Αθηνά Σπύρη Αλκμάνος 124

یہاں نمبر 4 سے مراد اس کا باپ ہے۔
اس کا باپ نمبر 4 میں شامل ہے۔
یہ ایک ایسا نمبر 4 ہے جس میں کئی ممکنات شامل ہیں
اُسے ایک ٹیکسٹ موصول ہوتا ہے جو اُسے اجازت عطا کرتا ہے۔

وہ یہ تھا:

ΑΘΗΝΑ ΑΘΗΝΑ ΣΠΥΡΗ ΑΛΚΜΑΝΟΣ 12 ΜΕΤΑΚΙΝΗΣΗ 4

تم اپنے باپ سے ملاقات کرنے جا سکتی ہوں، نمبر 4 وجہ کی اجازت عطا کی جاتی ہے۔
یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یورپ میں چیزیں تبدیل ہو چکی ہیں۔
چیزیں تبدیل ہو چکی ہیں بغیر اجازت لئے۔
یونانی زبان دیکھنے میں کتنی خوبصورت لگتی ہے۔

یہ:

ΑΘΗΝΑ

اتھنیا ہے۔
زبانیں الفاظ اور لکیروں کے مقامات ہیں
ایک خوفناک ڈراؤنا جملہ دیکھنے میں خوبصورت لگ سکتا ہے۔
یہ ایک ایسی زبان میں خطرہ ہے جو ہم نہیں جانتے۔
کبھی کبھار خوبصورتی بھی گرد جیسا کام کرتی ہے اور ہمیں دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔
'ہنگری' وزیر اعظم کے اختیارات میں مزید اضافہ کرتا ہے'۔
'آسٹریا اپنے شہریوں کو پابند کرے گا کہ وہ سپر مارکیٹ جاتے وقت ماسک پہنیں'۔
ممّا نے ابھی تک ڈیلان کا نیا گانا نہیں سنا ہے۔
جانور، پناہ گاہیں اور برف کے تودے۔

بہت ساری چیزیں ہیں تم جن کے بارے میں تحقیقات کر سکتے ہو۔

متفرق اجزا کے امتزاج سے پیدا ہونے والا نظام فکر، گھر سے باہر نکلنے کی وجوہات۔

چھ وجوہات: صحت (1)، غذا (2)، پیشہ (3)، ہمدردی (4)، طلاق اور کسی دوسرے گھر میں موجود بچے (5)، تقریب میں شرکت (5)، کتے کو چہل قدمی کروانا (6)۔

یونانی آج بھی ہمیں سکھا رہے ہیں۔

تیزی سے بات کرنا یوں جیسے تمہارے پاس ہوش و حواس کھونے سے پہلے چند ہی سیکنڈ باقی بچے ہوں۔

'اگر تمہیں ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے' اور تم بھوکے نہیں ہو، اگر تمہارے پاس پیسے ہیں اور کوئی تمہارے زیرِ کفالت نہیں ہے' اگر تمہیں طلاق نہیں ہوئی ہے اور تمہارے بچے کسی اور جگہ پر نہیں ہیں، اگر کسی شادی یا تدفین سے تمہارا لینا دینا نہیں ہے اور اگر تمہارے پاس کوئی کُتا نہیں ہے، تو پھر تم باہر کیوں جا رہے ہو؟'

پھر وہ پوسٹ کارڈ بھی تو ہیں جن میں لوگ اپنے راز بتاتے ہیں، فرینک ویرن کی طرف سے:

'میں نے اُسے کتنی' مرتبہ خود سے بدسلوکی کرنے دی، 3۔'

میں تصور کرتا ہوں کہ ہر مرتبہ بے عزتی کروانے اور گالی کھانے کے بعد ایک عورت دیوار پر ایک نشان لگا دیتی ہے۔

سینکڑوں نشانات، جیسے قیدی دن گنا کرتے ہیں۔

ایک مخصوص جگہ پر یہ نشانات ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور آپس میں جُڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔

اور جو پہلے چھوٹے چھوٹے نشان ہوا کرتے تھے اب لکیریں اور داغ دھبے بن جاتے ہیں۔

تم نے ساری دیوار/ غارت کر کے رکھ دی ہے، وہ کہتا ہے۔

ہم وجہ نمبر 7 کو بھول رہے ہیں۔

گھر سے اس لئے باہر نکلنا تاکہ گھر میں موجود کسی شخص سے فرار حاصل کیا جائے۔

یہ تو ہمیشہ ممکن ہے کہ یونانیوں کی تھوڑی بہت اصلاح کی جائے/ بہتری لائی جائے مگر زیادہ نہیں صرف معمولی سی۔

اسپین میں مزید ۸۱۲ افراد لقمۂ اجل بن گئے

جرمنی میں ٦٦۔

جرثومہ دندناتا ہوا میکسیکو میں داخل ہو جاتا ہے۔
نیویارک کی ریاست میں پہلے ہی ایک ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔
پوپ فرانسس نے اٹلی کے صدر سے ملاقات کی ہے۔
زمبابوے تین ہفتے کے لئے قرنطینہ میں جاتا ہے۔
ڈزنی تھیم پارک بند کئے جا رہے ہیں۔
ڈرمنڈ ڈی آندرادے کی شاعری سے ایک سطر:
'راضی برضا اشیاء پر بجلی گر پڑی'
ہالینڈ کے ایک میوزیم سے وانگ گاف کی ایک تصویر چرا لی گئی ہے۔
پولیس نے پرتگال سے ایک دعائیہ اجتماع کو تتر بتر کر ڈالا جس میں گیارہ افراد شریک تھے۔
میں اپنے اردگرد دیکھتا ہوں، لوگوں نے اب حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔
شام کو اتھینا مجھے ایک پیغام بھیجتی ہے:
میں باہر جا رہی ہوں، وجہ نمبر 2۔
میں بھی باہر جا رہا ہوں، وجہ نمبر 6۔
میں اپنی کتیا روما کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔
میں ایک کتے اور چند الفاظ کے ہمراہ جا رہا ہوں۔

—...—

'خدا تمہیں اس وقت باہر جاتے ہوئے اور واپس آتے وقت اور اُس کے بعد بھی، سدا کے لئے ہمیشہ محفوظ اور زندہ سلامت رکھے۔'

۱۱ اپریل

کھانے پینے، دواؤں اور لازمی اشیاء کے علاوہ باقی تمام دکانیں بند ہو چکی ہیں۔
ہنگامی حالت۔
کچھ ملکوں میں پھولوں کی دکانیں کھلی ہیں۔

ہنگامی حالات میں پھولوں کی ضرورت پڑتی ہے۔
لیکن ان کا کوئی تعلق خوب صورتی سے نہیں: یہ پھول مرنے والوں کے لیے ہیں۔
ان کے لیے جو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی سونگھ سکتے ہیں۔
مردہ افراد کو زندہ لوگوں کا پیار اب بیمار نہیں کرسکتا، کوئی کہتا ہے۔
کبھی بھی خوب صورتی کو نہ بھولو، کبھی بھی نہیں۔
ایک دوست کہتا ہے جس کی داڑھی تباہ حال اور قمیض شکن آلود ہے۔
جنازے پر پھول خوش ذوقی نہیں بلکہ کارآمد ہیں۔
وہ خوب صورت نہیں ہیں: بس اپنا کام کر رہے ہیں۔
'میں ایک انسان ہوں،' سن ساٹھ کی دھائی میں سیاہ فام لوگوں کے گلے میں لگی تختیوں پر لکھا ہوتا تھا۔

میں ۲۰۲۰ میں ہزاروں لوگوں کو اپنے گلے میں ایسی تختیاں لٹکائے گلیوں میں گھومتا تصور کرتا ہوں۔

میں ایک انسان ہوں۔

'یو۔ ایس۔ اے میں ہلاکتوں کا نیا ریکارڈ۔ مرنے والوں کی تعداد ۹ ستمبر میں مرنے والوں سے بڑھ گئی۔'

کھڑکی کی دوسری جانب سے مجھے بتایا جاتا ہے کہ ایک پڑوسی بائبل کو تھامے ہوئے ہے یا پھر بائبل نے پڑوسی کو تھام رکھا ہے۔

کیونکہ وہ کہتا ہے، یہی پڑوسی، بائبل سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے: میں تمہارے ہاتھوں میں ہوں!

کبھی کبھی وہ باآوازِ بلند پڑھتا ہے۔
یروشلم، نرم دل بن جاؤ۔ جس نے تمہیں یہ نام دیا تھا وہی تمہیں راحت بھی دے گا۔'
آج سے سماجی خدمت کا شعبہ، استحصال کے شکار بچوں سے ان کے گھر پر معمول کی مزید کوئی ملاقات نہیں کرے گا۔

'پرورش گاہِ اطفال سے فرار ہوجانے یا زیادتی ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔'
'مارچ کے مہینے میں کاروں کی خریداری میں ۵۰٪ فیصد کمی۔'

'موت کے اظہار کی ایک تالیف: نوکریاں ختم ہو چکی ہیں۔'
'اشیائے صرف سے لگاؤ اور رغبت کی جگہ اب مشترکہ معاملات کو لے لینی چاہیے مشترکہ معاملات۔'
پہلی بار دنیا کے نقشے پر: نیچے سے اوپر تک، بائیں سے دائیں، مشترکہ معاملات۔
اطلاعات، بھوکے کے لیے روٹی۔
ایک اضطرابی کیفیت میں صَرف شدہ مقدار۔ کتنی اموات ہوئیں؟
کیا کریں؟
احتیاط برتیں اپنے پیروں کے ساتھ، اپنے جوتوں کے ساتھ، اپنی پتلون کے ساتھ، اپنی قمیض کے ساتھ، اپنے اسکرٹ کے ساتھ، اپنے کپڑوں کے ساتھ، اپنی جرابوں کے ساتھ، اپنے دستانوں کے ساتھ، اپنے منہ کے ساتھ، اپنی آنکھوں کے ساتھ اور اپنے بالوں کے ساتھ۔
ایک مگر مچھ کچھ کھائے بغیر مہینوں زندہ رہ سکتا ہے۔
'روس نے طبی سامان کی ایک کھیپ ریاست ہائے متحدہ بھیجی ہے۔'
اچانک، اپنے ہاتھوں کی آگاہی۔
گزشتہ کچھ ہفتوں سے وہ کچھ زیادہ ہی وجود رکھنے لگے ہیں۔
ہم سب دست کار ہیں۔
چیزوں کو چھوتے ہوئے، اپنے ہاتھوں کا انتہائی خیال رکھتے ہیں۔
ایک دست کار، سبزیاں سنبھالتے ہوئے، انہیں دھوتا ہے، جراثیم سے پاک کرتا ہے۔
توجہ اشیا پر مرکوز۔
ہر شئے چمک رہی ہے، کبھی کبھی ایک ایسی چمک سے جو خطرناک ہے۔
ہر شئے بھرپور انداز میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔
کھانا اور اشیا۔
اپنے جسم کی، اور دیگر اشیا کی حفظانِ صحت کے اصولوں پر صفائی ستھرائی۔
جسم ایک بار پھر مقدس بن چکا ہے۔
ایک ایسی شئے جس کی حفاظت ہر قیمت پر کی جانی چاہیے۔
میرے پاس ایک مجموعہ ہے جسے میں دنیا کا شہر کہتا ہوں۔

مختلف شہروں کی عمارتوں اور گھروں کے ننھے ننھے ماڈل۔
اب اسے بھی بند کر کے ایک طرف رکھ دیا گیا ہے۔
تصور کر رہا ہوں کہ کیا دنیا کو اس طرح سے باندھ کر ایک طرف رکھا جا سکتا ہے۔
جیسے گھر بدلتے وقت کرتے ہیں۔
اسے گودام میں رکھ دو۔
کئی لوگوں کے لیے، بیرونی دنیا گودام میں رکھ دی گئی ہے۔
ایک نظم کی سطر: میں خدا کا، کسی بسیار خور آدمی کی طرح، بھوک کی شدت سے انتظار کرتا ہوں۔
رمبوٹ اور اس کے گرد آتشک
بیماریاں اپنے نام بدلتی ہیں۔
ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی خود کو ناقابلِ شناخت بنانے والی بات ہو۔
اسپین سے ایک مترجم دوست مجھے بتاتا ہے کہ اس کا ایک دوست انتہائی نگہداشت میں ہے۔
اُس کی عمر ۵۱ سال ہے اور اسے کوئی اور بیماری نہیں ہے۔
تقریریں، تمہارے کانوں پر تمہارے ہاتھ رکھوا رہی ہیں۔
'کچھ ارواح ایسی تیز رفتار ٹرینیں ہیں کہ ہمیں یہ دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملتا کہ وہ خالی ہیں۔'
ہمیں ٹرین کو روکنا ہوگا۔
منہ میں جُراب دبائے، یہ روما چلی آ رہی ہے۔
گمشدہ اشیا کی گدڑیا۔
حُبری ہر اس چیز کو حیرت سے دیکھتی ہے جسے اس نے پانچ منٹ قبل بھی حیرت سے دیکھا تھا۔

وہ پرچھائیوں سے مسحور ہو جاتی ہے۔
میں اپنی جیکٹ سختی سے کھینچ کر بند کر لیتا ہوں۔ باہر شدید بارش ہو رہی ہے۔ کئی بار محصور فوج بھی اس بات پر خوش ہوتی ہے کہ وہ باہر جانے کے قابل نہیں ہے۔ ہم بتدریج کوھنا سیکھ رہے ہیں، ایک دن پھر اُس کے بعد اگلا دن۔

۳ اپریل

بورس جانسن ہر ایک سے کہتا ہے کہ وہ ویک اینڈ پر گھروں پر رہیں۔
چاہے موسم کتنا ہی سہانا کیوں نہ ہو اور ہر کوئی مچل رہا ہو، بہتر یہی ہے کہ گھر میں رہا جائے،
بورس جانسن کہتا ہے۔
برائے مہربانی، برائے مہربانی، وہ دُہراتا ہے۔
برازیل میں کچھ ایسے ماسک تقسیم کیے جا رہے ہیں جن پر نظم کی چند سطریں درج ہیں۔
ایک طرح کی مزاحمت، وہ کہتے ہیں۔
ایک پر یہ الفاظ لکھے ہیں: میں دنیا پر بابونہ کے پھول جتنا یقین رکھتا ہوں، اور آگے نام
کے دو حرف ہیں: ایف۔ پی۔ (پیسوآ)۔
میں نام کے وہ حروف یاد کرتا ہوں جو نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کے بستر کی
چادروں پر اُن کی نانی دادی نے کانپتے ہاتھوں سے کشیدہ کاری کر کے بنائے تھے۔
یہ گاؤں کی عام روایت تھی۔
ایک حرف جو بیک وقت کہتا تھا:
چاہت اور ملکیت۔
لیکن میرے خیال میں درست سطر یوں ہے: میں دنیا میں اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا کسی
بابونہ کے پھول میں۔
معمولی سا فرق۔
جس دادی نے ماسک پر ان الفاظ کی کڑھائی کی تھی اس نے ایک عمدہ ٹائپ کی غلطی کا
اضافہ کر دیا۔

دادا، دادی، نانا، نانی کی ساری خطائیں معاف کر دی جائیں گی۔
پھول، گھاس، درخت۔
یہ ایک دلچسپ خیال ہے، ایسا یقین رکھنا جیسا کوئی درخت رکھتا ہے۔
مجھے درختوں پر یقین ہے یا میں درختوں کی مانند یقین رکھتا ہوں۔

درخت گلے شکوے نہیں کرتے نہ ہی وہ توجیح پیش کرتے ہیں۔
کسی درخت کی مانند یقین رکھنا بھی ممکنات میں سے ایک ہے۔
واشنگٹن پوسٹ اور ساؤ پاؤلو کے ریاستی اخبار ایستا داؤ میں: لاطینی امریکہ کے سب سے بڑے قبرستان کی فضائی تصویر۔
اس قبرستان، والا فارموسا، ساؤ پاؤلو میں وہ انسانی جسم کے ناپ کی سینکڑوں قبریں پہلے ہی سے تیار کررہے ہیں۔
انھوں نے اس کام کے لیے ۲۵۰ گورکن لیے ہیں۔
اوپر سے دیکھنے پر یہ زرعی اراضی لگتی ہے جو دنیا کے نرالے ترین اور نامانوس پھلوں کے لیے ہیں۔جن کی مانگ سب سے کم ہے۔
ایک فاصلے پر، بہت زیادہ قریب بھی نہیں، جیسے وہ ابھی بھی چھوت کی بیماری لگا سکتے ہوں۔
قبریں اس شکل میں بنائی گئی ہیں جس میں جسم کو بالآخر رکھا جاتا ہے۔
میں بارہ ماہ والے بچوں کے لیے ناپ کے اُس کھیل کا سوچتا ہوں۔
چوکور ٹکڑے کو اس شگاف میں ڈال دو جو چوکور ٹکڑے سے ملتا جلتا ہے۔
دائرے کو دائرے سے ملتی جلتی خالی جگہ میں ڈال دو۔
خالی جگہ میں متوازی الاضلاع سے ملتا جلتا سانچا ہے۔
دو ڈھائی برس کے بچے ایسا آسانی سے کرلیتے ہیں۔
لیکن فضا سے جائزہ لینے سے، ساؤ پاؤلو میں قبرستان کی یوں تیاری، بڑوں کا ایک ایسا کھیل دکھائی دیتا ہے جو ناقابلِ برداشت ہے۔
لاش کے وزن سے زیادہ وزنی کوئی اور چیز نہیں، ہائیڈیگر نے ایک مرتبہ لکھا تھا۔
میں اُس وزن کا تصور کررہا ہوں جو گورکن پہلے ہی اُٹھا چکے ہیں۔
واشنگٹن پوسٹ: تصویر۔
انسانی جسم کے ناپ کا ایک سانچا بنایا گیا تھا تاکہ انسانی جسم کو اس دراز میں ڈالا جاسکے۔
تمام کھیل ملتوی کردیے گئے ہیں۔
ماسوائے سنجیدگی کے مزید کچھ بھی نہیں، خالی جگہ کو بھرنے کا انتظار
ولا فارموسا کا رقبہ ۷۶۳،۰۰۰ اسکوائر میٹر ہے۔

۲۵ ،۱۷ ،۹۳ ے

میں فنکارہ ریچل وائٹ ریڈ کو یاد کرتا ہوں

اس نے ویانا میں ہولوکوسٹ یادگار میوزیم کے اندر کنکریٹ بھر دیا تھا۔

ہم باہر نہیں جاسکتے، ہم صرف یہیں رُک سکتے ہیں۔

ہم وہاں ہونے کے تجربے سے نہیں گذر سکتے۔

وبا کے دنوں کے برعکس۔

اب بیرونی دنیا ایک نادکھائی دینے والے کنکریٹ سے بھری ہوئی ہے جو ہمیں باہر آنے کی اجازت نہیں دیتا۔

میں ایک لنک پر کلک کرتا ہوں جو شہر کی دیگر جاذبِ نظر عمارتوں کے ساتھ ساتھ ریچل کی ویانا یادگار دکھاتا ہے۔

وہ ایک مطالعاتی دورے کے دورانیے کے متعلق بات کر رہے ہیں جس میں یادگار کا (بیرونی) دورہ شامل ہے وغیرہ وغیرہ۔

آپ ایک ایسی جگہ کے دورے پر کیا پہنیں گے جس کے اندر جا نہیں سکتے؟

میں نہیں جانتا۔

ایک فلم کے ایک کردار کا مکالمہ:

'کہا جاتا ہے کہ آلوچے کے شگوفے کو اپنی مہک فروخت نہیں کرنی چاہیے'

ایک کورین فلم۔

میں نے یہ سطر اپنی چوکور خانوں والی نوٹ بک میں لکھ لی۔

ملکہ ایلزبتھ ثانی آئندہ اتوار، بکنگھم پیلس سے، ملک سے خطاب کر رہی ہیں۔

وہ ۹۳ برس کی ہیں۔

ایک انٹرویو میں، ایمر کلنک کہتا ہے کہ وہ بوریت پر شارک مچھلیوں کو ترجیح دیتا ہے۔ میں تلاش کرتا ہوں کہ ایمر کلنک کون ہے۔

انٹرنیٹ کام نہیں کر رہا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں، ایک بار پھر کوشش کرتا ہوں، اور پھر اس کے متعلق بھول جاتا ہوں۔

ہمیں مسلسل یقین پر کام کرتے رہنا چاہیے۔

علی الصبح اُٹھنا تاکہ یقین پر کام کیا جاسکے۔

۷ اپریل

میں ژاں لِک گوداں کو دیکھتا ہوں۔ انسٹا گرام لائیو۔
انگلیوں کے درمیان کبھی کبھار سگار لیکن منہ میں ہمہ وقت، ہمیشہ۔
اس کے اردگرد، چند چہروں پر ماسک ہیں۔
وہ واضح یا نیم واضح انداز میں بات کرتا ہے درمیان میں طویل وقفے۔
میں گودا کے کیمرے کو ٹی وی نیوز پر مرکوز تصور کرتا ہوں۔
یا اخبارات کے صفحات پر۔
وہ یوں دیکھتا ہے جیسے عملِ تنویم کے زیرِ اثر ہو۔
کیمرے کی آنکھ دست بردار ہو کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو جاتی ہے۔
جیسے باہر سے دیے گئے احکامات کی بجا آوری کر رہی ہے۔
بس اتنا بہت ہے، وہ کہے گا۔ خبریں۔
روزانہ کا مانو چاؤ اجلاس:
'خوب صورت عورت'
'ل تمہیں خدا پر ایمان نہیں تھا'
'آج کا دن خوش قسمتی سے، گزشتہ دن نہیں ہے'
حُسنِ اتفاق۔
مائیکل گوو، کابینہ دفتر کا وزیر۔
بی بی سی ریڈیو پر انٹرویو، برطانوی وزیراعظم کے ہسپتال میں داخلے کے بارے میں۔ وہ 'زندگی کی اُس لگن' کے متعلق بات کرتا ہے جو بورس جانسن رکھتا ہے، چاہے وہ ٹینس کورٹ میں ہو یا حکومت میں۔'
وہ فطرت کی ایک قوت ہیں، وہ کہتا ہے۔

اخباری خبروں کے مطابق، وہ وینٹی لیٹر پر نہیں ہیں۔
گودا کی سطر: یہ خون نہیں ہے، یہ سرخ ہے۔
آپ پردے پر جو دیکھ رہے ہیں وہ خون نہیں ہے، وہ ایک رنگ ہے۔
پردے کے علاوہ خون، خون ہوتا ہے۔
لیکن اس وبا میں کوئی خون نہیں ہے۔
ان نایاب المیوں میں سے ایک جہاں کوئی خون نہیں ہوتا ہے۔
ایسے المیے کو سمجھنا دشوار ہے جس میں خون ہی نہ ہو۔
قیرنطینو، ٹیرنطینو اور قرنطینو سے لائی گئی تباہی:
ایسا خون جو ممکنہ سرخ ترین خون سے سرخ تر ہے۔
چاروں عناصر کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔
مٹی، ہوا، پانی اور آگ۔
یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کا تعلق ہوا کے عنصر سے ہے۔
پھیپھڑے اور سانس لینے میں دشواری۔
جب لوگ ہسپتالوں میں آئی سونامی کے متعلق بات کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں۔
بلاشبہ یہ پانی کی سونامی نہیں ہے، بلکہ بیمار جسموں کی۔
ایک ٹھوس سونامی۔
ایک ٹھوس حالت میں جسموں کی سونامی جس میں ہوا نام کو نہیں ہے۔
ایک ٹھوس سونامی جو سانس لینا چاہتی ہے۔
ہوا کا ایک المیہ۔
اور ہاں تھوڑی سی آگ کا بھی۔
لاطینی امریکہ کے چند شہروں کی تصاویر: گھر کے سامنے ان افراد کی میتوں کو نذر آتش کیا جا رہا ہے جنہیں ریاست نے وصول نہیں کیا۔
تاکہ وہ بیماری پھیلنے کا باعث نہ بنیں۔
یہ لاشیں بہت زیادہ ڈگری فارن ہائیٹ پر جلتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ جتنے پر کتابیں جل جاتی ہیں۔

یا نہیں۔
اشیا کی مزاحمت کی ایک درجہ بندی جیسے حیاتیات نے گڈمڈ کر دیا ہے۔
کبھی کبھار سب سے اہم وہ مادہ ہوتا ہے جو سب سے جلدی اپنا آپ آگ کے حوالے کر دیتا ہے۔
جسم کس درجۂ حرارت پر جل جاتے ہیں؟
میں گوگل سے یہ سوال پوچھتا ہوں۔
لیکن وہ کوئی واضح اور براہِ راست جواب نہیں دیتا۔
وہ پینترے بدلتا ہے، وہ ٹالتا ہے، وہ موضوع بدل دیتا ہے۔
مثلاً: ایک صفحہ ظاہر ہوتا ہے جس کا عنوان ہے: ہمارے جسم پر سردی کے اثرات۔
یہاں تک کہ مشینوں اور کمپیوٹر سے حل شدہ ریاضی کے فارمولے کی بھی ایک محدود اہلیت اور خجالت ہے۔
میں نے گوگل سے دوبارہ یہ سوال نہیں پوچھا۔
میں اصرار نہیں کرنا چاہتا۔
میری گدڑیا روما کی گردن کے کالر نے اسے ایک بالوں بھرے گھریلو ٹینک میں تبدیل کر دیا ہے۔
وہ انسانوں میں خیالی عضو کے متعلق بات کرتے ہیں: جسے آپ کھو چکے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ذہنی طور پر محسوس کرتے ہیں۔
جانوروں کے ساتھ اس کے برعکس ہے: سر کے گرد نلکی ابھی جسم میں داخل نہیں ہوئی ہے۔
روما ہر چیز سے یوں ٹکراتی ہے جیسے وہ نابینا ہو۔
خبریں: نیویارک کے ایک کیتھیڈرل کی تصویر۔
ہر جگہ اسپتال کا امکان ہے۔
خالی جگہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟
پرتگالی نائب ڈائریکٹر برائے صحت کیٹا رینا سینا مر گئی ہے، عمر ۷۴ سال، ایک طویل بیماری کا شکار'
'اس نے تمام عمر بلیوں کو برا بھلا کہتے گذاری اور آخر میں اسے ایک نے گود لے لیا تھا

جس کی وجہ ساتھی بن گئی تھی۔'

'اس نے مجھے زیتون کا ایک درخت دیا تھا' وہ میرے ساتھ روئی اور میرے لیے روئی، اس نے میری بہت مدد کی، واقعی بہت، ایک مکمل ساتھی۔ میں تمھیں اتنا یاد کرتی ہوں کہ جس کا شمار ممکن نہیں۔ امید تو یہی ہے کہ میں تمہاری ہر توقع پر پوری اتری ہوں گی، صحت کی ڈائریکٹر جنرل نے لکھا تھا۔

دن میں کس وقت ہمیں جذباتی ہونا ہے؟

مجھے بتایا گیا ہے کہ ایک باپ جب بھی رونا چاہتا ہے تو بالکونی پر جا کر رو لیتا ہے تا کہ اس کے بچے نہ دیکھ سکیں۔

اس کے بچے سمجھتے ہیں کہ وہ تازہ ہوا کی خاطر بالکونی میں جاتا ہے۔

میں اخباری کہانی پڑھتا ہوں۔

'آج رات کھڑکی سے باہر جھانکنے کی ایک اچھی وجہ یہ ہے کہ 'آج رات ایک گلابی چاند دکھائی دے گا۔'

'یہ پورا چاند ۱۴ فیصد زیادہ بڑا اور ۳۰ فیصد زیادہ چمک دار نظر آئے گا۔'

یہ فیصد ہر چیز میں داخل ہو جاتے ہیں چاہے چمک ہی کیوں نہ ہو۔

یو کے میں روزانہ اموات کا ریکارڈ: گزشتہ ۲۴ گھنٹوں میں ۸۵۴

'فرانس: تازہ ترین اعداد و شمار بتاتے ہیں۔۔۔۔۔'

نیویارک، نیویارک۔

شائد باپ نہیں جانتا کہ بچے بھی رونے کے لیے بالکونی میں جاتے ہیں تا کہ ان کا باپ انھیں دیکھ نہ سکے۔'

وہ کہتے ہیں کہ وہ تازہ ہوا کے لیے وہاں جا رہے ہیں۔

جارج گبلر نے ایک دفعہ لکھا تھا: حقیقی صورتِ حال تب ہوتی ہے جب لائٹ ہاؤس روشنی کے رو رہ کر چمکنے کے دوران تاریک ہوتا ہے؛

'یہ گھڑی کی ٹِک ٹک کا درمیانی وقفہ ہے۔'

آج رات باپ اور بچوں کے لیے کھڑکی سے جھانکنے کی ایک اچھی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ فرض کر لیں کہ چاند ابھی بھی اہمیت رکھتا ہے۔

میں دوبارہ وہ اعداد و شمار پڑھتا ہوں: ریاست ہائے متحدہ میں حالیہ نئے بے روزگار افراد کی تعداد ایک کروڑ سے تجاوز کر گئی۔

چند ہی دور اتنے معاصر اور حقیقی ہوتے ہیں جتنا یہ اب ہے۔

حقیقی صورتِ حال ایک روشنی نہیں ہے، یہ اس کے برعکس ہے۔

'یہ تب ہوتی ہے جب روشنی کے رہ رہ کر چمکنے کے دوران لائٹ ہاؤس تاریک ہوتا ہے۔'

۱۳اپریل

برازیل میں یسوع، نجات دہندہ، ڈاکٹر کے لباس میں۔

فولہا ڈی ساؤ پاؤلو نامی اخبار میں تصویر۔

یسوع، ڈاکٹر کے اوور آل میں اسٹیتھسکوپ لیے ہوئے۔

ہم اوپر دیکھتے ہیں اور پُرسکون محسوس کرتے ہیں، ریوڈی جنیرو کا ایک رہائشی کہتا ہے۔

دوسرا کہتا ہے: مجھے خوف آتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ معاملات سنجیدہ ہیں۔

یسوع ایک ڈاکٹر کے لباس میں۔

ایک تکنیکی یسوع، جس نے اسکول میں تعلیم حاصل کی اور مشینوں کی مدد سے جانیں بچاتا ہے۔

'ایک شخص نے گھر پر ٹھہرنے کی پابندی توڑ ڈالی اور اپنی سابقہ بیوی کے پاس چلا گیا۔'

پرتگال کے شمال میں، ایک اور شخص گلی میں گھٹنوں کے بل جُھکا ہوا ہے جس کے سامنے سے ایک پادری یسوع کی صلیب اٹھائے گذر رہا ہے۔

اس سب کے باوجود، ہاتھوں کی اہمیت۔

وہ ڈاکٹر کا لباس پہنے ہوئے ہے، کوئی یسوع نجات دہندہ کے متعلق کہتا ہے لیکن اس کے ہاتھ وہی ہیں۔

ہاتھ، اکیسویں صدی میں بھی موجود رہتے ہیں۔ کوئی مشین انہیں ختم نہ کر سکی، ان کی جگہ نہیں لے سکی۔

برازیل میں ایک فنکارہ بتاتی ہے کہ اس نے گھر میں ایسی پرچھائیاں دیکھی ہیں جو اس سے

پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔
کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی اس مخصوص وقت گھر پر نہیں ہوتی تھی۔
میں ایک جسم کا تصور کرتا ہوں جو مکمل طور پر تکنیکی ہے اور مُلحد ہے سوائے اس کے ہاتھوں
کے جو ایمان رکھتے ہیں۔
ہاتھ، بقیہ جسم سے باہر نکلے ہوئے، گویا کہ ایسا ممکن تھا۔
پیٹ سیگر [۱]، بیسویں صدی کے پچھلے عشرے میں، ہاتھ میں بینجو لیے، آٹھ گھنٹے کام، آٹھ
گھنٹے تفریح اور آٹھ گھنٹے نیند کا مطالبہ کر رہا ہے۔
آج کل کے دن کی نئی تقسیم کے بارے میں سوچ رہا ہوں: ایک گھنٹہ خوف زدہ رہنے
کے لیے۔
نیو یارک کے گورنر، اینڈریو کومونے جرثومے کے یوں اچانک پھیلنے کی تفصیل بتائی:
'جس طرح سوکھی گھاس میں آگ پھیلتی چلی جائے جبکہ تیز ہوا چل رہی ہو'
اتاہوالپا یوپان قوئی [۲]، ارجنٹائن کا گیت کار، گلوکار اور ایک مِلونگا [۳] رقص جو طاقت ور ترین
کو توڑ کر رکھ دے۔ 'ناخوش مِلونگا، اُداس مِلونگا۔
طاقت ور ترین وہ ہیں جو بہت آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ جیسے کہ مشرقی اخلاقی تمثیل
ہمیں سکھاتے ہیں۔
یہ آپ کی اپنی قوت ہوتی ہے جو آپ کے زوال کا سبب بنتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔
جوڈو میں بدمعاش جتنا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے اتنی ہی شدت سے منہ کے بل فرش پر گرتا ہے۔
سینڈرز وائٹ ہاؤس کے لیے بائیڈن کی توثیق کرتا ہے۔
یوپان قوئی کی آواز، انسانوں میں سب سے سنجیدہ انسان کو چار سو ٹکڑوں میں توڑ کر رکھ
دیتی ہے۔

ایک سوال: کیا آپ اپنے گھر کی تمام پرچھائیوں سے واقف ہیں؟
اسپین میں زیادہ سے زیادہ دو افراد تدفین میں شرکت کر سکتے ہیں۔
وہ کہتے ہیں کہ جرثومہ پھیپھڑوں سے دماغ تک پھیل سکتا ہے۔
تابوت کے برابر میں کھڑے ایک رشتے دار کا عکس، دو میٹر پرے، ماسک پہنے ہوئے۔
تابوت کے سامنے ایک پادری، وہ بھی ماسک پہنے ہوئے اور دو میٹر پرے۔

فیصلہ۔ کون سے دو افراد مردہ شخص کو خدا حافظ کہیں گے؟

بڑا بھائی یا چھوٹا بھائی؟

بیوی یا بچہ؟

کبھی کبھار ایک اور فرد پہنچتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک۔

وہ رشتے دار نہیں ہیں، وہ خراج تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جس کسی کو بھی وہی خوف ہے اس کی وہی بو ہے، جس کی وہی بو ہے اس کا نام بھی وہی ہے، جس کسی کا نام بھی وہی ہے اس کو بھی وہی خوف ہے۔ اور جس کسی کو بھی وہی خوف ہے اس کی وہی بو ہے۔

جانور اپنی حسِ شامہ سے آپس میں امتیاز کرتے ہیں۔

جن کی سونگھنے کی حس ختم ہو جاتی ہے وہ اپنا خاندان کھو دیتے ہیں۔

ایک ہسپانوی پادری کہتا ہے کہ بہت سارے لوگ تدفین پر عائد ان پابندیوں کو نہیں سمجھتے، لیکن کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔

زندہ رہ جانے والوں کے لیے جنازے خطرناک بن چکے ہیں۔

میں تانی زاکی [1] کے ناول، پرچھائیوں کی تعریف میں، مشورہ دوں گا۔

'آئرلینڈ میں لاک ڈاؤن میں ۵ مئی کی توسیع؛ شائد وہ سب، جو کچھ لوگوں کے لیے ناراحتی اور پریشانی کا باعث بنے وہ دوسروں کی زندگیاں بچا لے گا'۔

ایک کے لیے معمولی سی زحمت، دوسرے کے لیے موت۔

ہم اتنے الگ تو کبھی نہ ہوئے تھے۔

مجھے زحمت کے لیے افسوس ہے لیکن اس کے بدلے میں زندہ رہنا چاہوں گا۔

ہر شخص، ایک دشمن

کوئی مجھے فون کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تین ہفتوں کے بعد گھر سے باہر نکلے ہیں۔

وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اُن کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔

بے گھر شخص ابھی تک گلی میں موجود ہے اور اسے یقین ہے کہ کوئی شئے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

میں بھوک سے بے حال ہوں، وہ کہتا ہے۔

اور واقعی، وہ ایسا لگ بھی رہا ہے۔
یوروپیین یونین کے صدر نے گزشتہ روز کہا تھا کہ بوڑھے لوگوں کو شاید سال کے اختتام تک گھروں میں محدود رہنا پڑے گا۔
وہ تین ویکسین کی بات کر رہے ہیں اور کسی بھی ویکسین کے ناممکن ہونے کی بات کر رہے ہیں۔
ہمیں چاہیے کہ ہم رُک جائیں اور ریوڈی جنیرو میں اس ڈاکٹر یسوع کی جانب دیکھیں۔
پوری صدی، ایک شخص کی مانند حیرت سے منہ کھولے اسی ڈاکٹر یسوع کی جانب دیکھ رہی ہے جیسے کہ اُس کے نیچے جو شہر تھا وہ ایک اسپتال تھا۔
ایک صدی جس کا منہ حیرت سے کھلا ہے۔
میں اچانک تصور کرتا ہوں کہ اس ایسٹر پر ہر گرجا گھر میں بہت سارے ایمان والے بھی اسی عالم میں ہوں گے۔
بے شک دوسرے وقتوں میں یہ بدعت رہی ہوگی لیکن اب نہیں۔
یسوع کو ڈاکٹر کا لباس پہنانا۔
صلیبیں، ہر طرف لاکھوں صلیبیں، جن کے ساتھ ڈاکٹر کے لباس میں یسوع۔
جس طرح کچھ بچے گڑیوں کو لباس پہنایا کرتے تھے۔
اوور آل اور ایک اسٹیتھسکوپ۔
میں سانس لیتا ہوں اور سوچتا ہوں: اتنے ذرا سے وقت میں کتنا سارا وقت گذر گیا۔
ایک ماہ میں ایک ہزار سال یا شائد اس سے بھی زیادہ
اتنے چھوٹے سے مہینے میں اتنا زیادہ وقت۔
اگر ایک نیا یسوع آتا ہے تو اُسے ایک ڈاکٹر بننے دو، وہ آج کل یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔
وہ ایک دوا یا ایک ویکسین مانگ رہے ہیں۔
ہمارے لئے گھر پر مزید رہنا اب ناقابل برداشت ہے۔

۲۰ اپریل

ہماری مادرِ محترمہ دریچہ صاحب، جی ہاں۔
ہر ایک اُس خالی جگہ کے انتظار میں ہے تاکہ وہ مزید خالی اور تہی ہو سکے۔
اُن اشیاء سے خالی ہو جائے جو دہشت کی لہر دوڑا دیتی ہیں۔
لوئی ویتوں ماسک، ۱۹۹۰ ڈالرز۔
ایک زردی مائل پیلے رنگ کے کیس میں، واقعی باوقار۔
اور اندر ایک تھیلی، وہی نام:
لوئی ویتوں۔
بظاہر تو کسی جڑاؤ زیور کا اشتہار لگتا ہے لیکن یہ بھورا ماسک ہے، سائز S۔
سائز S، چھوٹے کے لئے یا پھر خوف زدہ کے لیے؟
سائز S کا تصور کر رہا ہوں۔
دہشت زدہ ہو جانے کا سائز۔
شائد ہماری مادرِ محترمہ دریچہ ہمیں باہر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں، کچھ لوگ ہونٹ ہلائے بغیر دعا کر رہے ہیں۔
صرف اپنی آنکھیں استعمال کر رہے ہیں۔
'عظیم انسان اور دریا ٹیڑھے میڑھے ہی ہوتے ہیں'
ٹیڑھے میڑھے، لیکن اپنی منزل کی جانب،
نطشے پاگل ہو گیا اور اُس نے صرف یہ دیکھنے کے لئے اپنا سر دیوار پر دے مارا کہ شائد ایسا کرنے سے وہ بہتر ہو جائے۔
یہ سوانح نہیں ہے، اپنی طرف سے گھڑی گئی بات ہے۔
ذرا تصور کریں کہ آپ دیواروں سے سر ٹکرا کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں تاکہ بالآخر اپنے پڑوسی کو دیکھ سکیں۔
کپڑوں پر لکھے S کا مطلب اب چھوٹا ہونا نہیں رہا بلکہ خوف زدہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔

خوف زدہ سائز کے کپڑے۔
یہ اُن کا بہترین حوصلہ ہے
وہ ٹیڑھے میڑھے راستوں سے خوف زدہ نہیں ہیں۔

اپیال رواؤ، ۹۳ برس۔
وہ حال ہی میں کئی بار ہسپتال جا چکا ہے: ایک بار گرنے کے سبب اور پیشاب میں جراثیم

زدگی کے باعث۔
اُس کے انہی معائنوں میں ایک بار کووڈ 19 کی تشخیص ہوئی۔
اُس نے ہسپتال میں پندرہ دن گزارے۔
وہ بچ گیا، وہ واپس آ گیا۔
جب وہ گھر واپس پہنچا تو اُس کے پڑوسی اپنی اپنی بالکونیوں پر موجود تھے۔
گھر واپسی پر اُس کا استقبال تالیوں سے کیا گیا۔
کیا کسی ٹیڑھے میڑھے راستے سے اپنی منزل پر پہنچنا ممکن ہے؟ جی ہاں۔
کیا آپ سیدھے راستے پر چلتے ہوئے غلط مقام پر پہنچ سکتے ہیں؟ یقیناً۔
جمالیاتی داد و ستائش اور کسی ایسے شخص کی داد و ستائش کرنا جو بچ جاتا ہے۔
میں تھیٹر میں بجائی جانے والی تالیوں کے متعلق سوچتا ہوں
میں تالیاں بجا کر داد دیتا ہوں کیونکہ یہ خوبصورت ہے، میں داد دیتا ہوں کیونکہ یہ طاقت ور ہے، میں داد دیتا ہوں کیونکہ یہ مجھے سوچنے پر مجبور کرتی ہے، میں داد دیتا ہوں کیونکہ تم بچ گئے تھے۔
ایسے ماسک بھی ہیں جن پر چاندی اور سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے۔
قیمتی پتھر جڑے ماسک، ایک کار جتنی قیمت والے۔
ایک کارڈ پر ہاتھ سے لکھی تحریر: میں تازہ ہوا کے لئے، تازہ خیالات کے لئے شکر گزار ہوں۔
ایک تحریک: لوگوں کے شکر گذار ہونے کی۔
ایک عورت اپنی ٹانگوں کے سامنے ایک کارڈ رکھے ہوئے: میں اپنی اندام نہانی کے لئے

شکر گزار ہوں۔
ایک شخص کاؤبوائے ہیٹ پہنے، قمیض اتارے، جسم پر ہر جگہ نقش و نگار گدے ہوئے۔
وہ ایک کارڈ اٹھائے ہوئے ہے جس پر لکھا ہے: میں انٹرنیٹ پر مفت عریاں فلموں کے لئے

شکر گذار ہوں۔

ایک کتے کی گردن میں ایک کارڈ لٹکا ہے اور اس کے سامنے تین گیندیں رکھی ہیں۔
کارڈ پر لکھا ہے: میں کھیلنے کے لئے تین گیندیں ملنے پر شکر گذار ہوں۔
ایک نوجوان ایشائی مرد: میں ویتنام میں اُن تمام بیمار لوگوں کے لئے شکر گذار ہوں جو ابھی تک زندہ ہیں۔

میں دیوار کی سفیدی کو دیکھتا ہوں جو ابھی تک سفید ہی ہے۔
جب بارش ہو تب روزانہ کی ایک ذمہ داری: نظر رکھو کہ پانی سفیدی کو مٹا نہ دے۔
'بگ اپیل میں اعلیٰ حکام مارچ کے آغاز سے اب تک ۱۴۰۰۰ قیدیوں کو رہا کر چکے ہیں۔
ایکواڈور کے ایک صوبے میں، اپریل کے پہلے ۲ ہفتوں میں سینکروں اموات۔
گذشتہ روز، کنسرٹ: ہر سازندہ اپنے اپنے گھر میں۔
مِک جیگر [1] گاتا ہے: 'تم ہمیشہ وہ حاصل نہیں کر سکتے جو تم چاہتے ہو۔''
ایک اچھا خلاصہ۔
ایک اور ممکنہ خلاصہ: تم زندہ ہو، کبھی کبھار تم وہ حاصل کر لیتے ہو جو تم چاہتے ہو۔
رولنگ اسٹون [2] کا ڈرم بجانے والا چارلی واٹس، ڈرم کے تمام جھام کے بغیر گھر پر ہے۔
وہ اپنے سامنے رکھے سوٹ کیس پر ڈرم اسٹیکس سے تال بجاتا ہے۔
اور صوفے پر۔
'تم ہمیشہ وہ حاصل نہیں کر سکتے جو تم چاہتے ہو'
ساؤ پاؤلو کے ایک ہسپتال کے قریب ایمبولینس کے سائرن سنائی دیتے ہیں۔
اور اُن کاروں کے ہارن بھی جو ایمبولینسوں کو گذرنے نہیں دے رہی ہیں۔
بیمار روک دیئے گئے ہیں اور اس سیاسی ٹریفک کے بیچ انتظار کر رہے ہیں۔
ہارن اور سائرن ہوا کے مرکز پر قبضے کے لئے مقابلہ کر رہے ہیں۔
''تم ہمیشہ وہ حاصل نہیں کر سکتے جو تم چاہتے ہو۔'' پیارے۔
ریاست ہائے متحدہ کی ایک کار پارکنگ میں ایک بے گھر شخص کی تصاویر۔
یہ تصاویر حروف اور اعداد کے اوپر پڑی ہیں۔
مِک جیگر ز چلاتا ہے۔ اور چارلی واٹس، جو اَب ایک بوڑھا آدمی ہے، اپنے سامان کو ڈرم

نک کی طرح استعمال کرتے ہوئے پاگل دکھائی دیتا ہے۔
آپ کسی ایسے شخص کے لئے تالیاں کیسے بجا سکتے ہیں جو بچ نہیں سکا؟
شدید بارش ہوتی ہے اور پھر رُک جاتی ہے
وقفے وقفے سے بارش اور پھر کچھ روشنی۔
اُنہوں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اب تک یدش میں کیوں لکھتا ہے۔
ہر وہ شخص جو وہ زبان پڑھ سکتا تھا وہ موت کے کیمپوں میں مارا جا چکا ہے۔
آئزک بیشیوس لہ سنگر نے جواب دیا کہ وہ اُن کے بھوت اور آسیبوں کے لئے لکھ رہا تھا۔

تا تا تا تا تا تا تا تا تا تا تا تا

کوفت، اکتاہٹ اور بے کیفی کے درمیان مچایا گیا شور؟
پڑوسی کی دنیا میں کوئی چیز دولخت ہوگئی ہے۔
میں باہر دیکھتا ہوں: درخت، زمین، سفید دیوار اور بے ڈھب پتھر، بہت سارے سائے اور کتے۔

۲۸ اپریل

ہمیں جانوروں کو داد دینی چاہیے، گزشتہ روز کا روزنامچہ۔
عوامی اور ذاتی تشکر۔
اُنہوں نے اب تک بہادری دکھائی ہے۔
میں اپنے جانوروں کو تالی بجا کر داد دیتا ہوں اور وہ میری طرف دیکھتے ہیں: یہ بے وقوف چاہتا کیا ہے؟
بورس جانسن ایک منٹ خاموشی اختیار کرنے کے لئے خزانے کے چانسلر کے ساتھ اپنی میٹنگ روک دیتا ہے۔
ایک منٹ کی خاموشی سے معیشت میں رَخنہ ڈالنا۔

یہ رسم جو روزانہ دن کے درمیان دُہرائی جا سکتی ہے۔
معیشت کے عین درمیان: ایک منٹ کی خاموشی۔
بچوں میں کورونا وائرس سے ملتی جلتی بیماری کی علامات کا پتہ لگا لیا گیا۔
بڑی تعداد میں ڈاکٹر، نرسیں اور دوسرا اسٹاف مر گئے ہیں۔
جنہیں بچانے کی وہ کوشش کر رہے تھے اُن میں سے دس فیصد، اچانک ملیا میٹ: جرثومہ، علامات، بخار، کبھی کبھار فوراً، ایک ممکنہ خدا حافظ اور موت۔
میکسیکو میں کچھ ڈاکٹروں اور نرسوں کی بے عزّتی کی جارہی ہے۔
اُنہیں جراثیم سے پاک کرنے کے لئے اُن پر پانی ڈالا جارہا ہے۔
ایک ڈاکٹر کو ایک بیمار شخص سمجھا جارہا ہے۔
اس بیماری نے بیمار انسانوں، ڈاکٹروں طبی آلات، ہسپتال، گلی محلّے، شہر اور ملک کو اچانک اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔
اور آپ کا سر۔
تماشائی کی حیثیت غائب ہو جاتی ہے۔
بیمار شخص یا ممکنہ بیمار شخص۔
تیسری کوئی شئے چُننے کے لئے نہیں ہے۔
تالیاں، خاموشی اور پانی سے بھری بالٹیاں۔
زندہ رہ جانے والوں اور مر جانے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، گواتوئل کی میئر سنتھیا وٹیری نے کچھ دن قبل کہا تھا۔
وہ شہر کے ہسپتالوں اور قبرستانوں کے متعلق بات کر رہی تھی۔
شہر دو نئی جگہیں کھول رہا ہے اُنہیں لینے کے لئے جو چل پھر نہیں سکتے یا سانس نہیں لے رہے ہیں۔
میں پانی سے بھری ایک بالٹی اٹھاتا ہوں اور پانی کا وزن مجھے مسحور کر دیتا ہے۔
یہ سیسہ، پتھر یا ریت نہیں ہے۔
یہ ایک صحت بخش وزن ہے؟ ایک مہربان وزن۔
لیکن طبیعیات کی کوئی اخلاقی حالت یا شکل نہیں ہوتی، کوئی دردمندی دبے پاؤں نہیں چل

رہی کہ مبادا ایک اور مشتی اپنی نیند سے بیدار نہ ہو جائیں۔
وزن، وزن ہے لیکن جب یہ وزن جھولتا ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے۔
'ووھان میں ہوئی نئی تحقیق نے ہوا کے ذرّات میں جرثومے کو دریافت کیا ہے۔'
لیکن ابھی کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ ہوا سے بیماری لگ سکتی ہے یا نہیں۔
اسپین میں بچے گلیوں میں نکل آئے ہیں اُنہیں قانونی طور پر اجازت دی گئی ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل سکتے ہیں۔
یوں لگتا ہے جیسے وہ پہلی بار تیز ہوا چلتی دیکھ رہے ہیں۔
وہ اب ایک دکھائی نہ دینے والی ہوائی شئے نہیں رہی ہے اور اب اس کا استقبال باقاعدہ جشن منا کر کیا جارہا ہے۔
افریقہ میں مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور اب شرح پیدائش میں ہنگامی اضافے، کی باتیں کی جارہی ہیں۔
ہنگامی حالات میں ایک قدیم بادشاہت کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا ہے۔
وزیر اوّل ایک ایسی سلطنت کی عارضی بادشاہ بن جاتا ہے جو کہیں وجود نہیں رکھتی ہے۔
اسپین میں بچے، پہیہ دار تختے 'اسکیٹ بورڈنگ' کا کھیل دریافت کر لیتے ہیں اور تمام تر تیز رفتاری اور عدم توازن کو وہ پاؤں مل جاتے ہیں جو کافی عرصے سے ساکت تھے کچھ اطالوی شہروں میں پولیس کے گھڑ سوار پیش قدمی کرتے ہیں انہوں نے ماسک پہنے ہوئے ہیں۔
ایسے گاؤں بھی ہیں جہاں نہ تو لوگ ہیں اور نہ ہی گلیوں میں کوئی دکھائی دیتا ہے لیکن وبا سے پہلے بھی وہاں نہ تو لوگ تھے اور نہ ہی گلیوں میں کوئی دکھائی دیتا تھا۔
'ویکسین کے بغیر یہ 'ازحد دشوار' ہوگا کہ اولمپک گیمز ۲۰۲۱ء میں منعقد کیے جاسکیں۔'
اندازہ ہے کہ برٹش ایرویز دس ہزار سے زائد نوکریاں ختم کردے گی۔
اسپین میں جسمانی طور پر حاضر پڑھائی ستمبر تک متوقع نہیں۔
ساری دنیا میں ایسا ہی ہے۔ یہی۔ اوپر سے نیچے تک۔
کئی لوگ ماسک پہننے سے انکاری ہیں اور لوگ کن انکھیوں سے اُنہیں دیکھتے ہیں۔
یہ کن انکھیوں سے دوسرے انسانوں کو دیکھنا اس صدی میں طوفانی انداز سے عود آیا ہے اور یہ اتنی جلدی رخصت ہونے والا بھی نہیں ہے۔

انسانوں کو ایک نئی نوع جو بجائے سامنے دیکھنے کے کن انکھیوں سے اطراف میں دیکھتے ہیں۔
لاطینی امریکہ میں اب سے پہلے، جب کاریں ٹریفک سگنل پر رکا کرتی تھیں تو وہاں لوگ مٹھائیاں اور پانی بیچتے نظر آتے تھے۔
اب وہ ٹریفک سگنل پر ماسک بیچتے ہیں لیکن چند جگہوں پر بتی ہری ہو چکی ہے۔
اور کاریں حرکت نہیں کر رہی ہیں۔
اس سے اچھا کاروبار ہو نہیں سکتا۔

کووڈ۱۹ڈائری

۲۲ مارچ ۲۰۲۰ء

جب اقوام متحدہ نے کورونا کو عالمی وبا یا ''پین ڈیمک'' قرار دیا تو یہ خادم چھٹی پر پاکستان گیا ہوا تھا۔ ہماری افسر اعلیٰ ایک پیاری سی فلسطینی خاتون ہیں، محترمہ رملہ خالدی۔ انہوں نے ازراہ شفقت پیغام بھیجا کہ اگر پریشانی یا ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہو تو گھر بیٹھے حتی المقدور کام کرتے رہو یا چھٹی بڑھالو۔ احباب جانتے ہیں کہ اس خادم کا کام ہی آفات کی روک تھام اور ان کے اثرات کے تدارک سے متعلق ہے، سوگوارانہ ہوا کہ دنیا میں آفت ٹوٹ رہی ہو اور ایسے میں گھر بیٹھا جائے۔ سو جوں توں کر کے ایک ہفتہ قبل دمشق پہنچ ہی گیا اور اس فیصلے پر ہرگز تاسف نہیں ہے۔ عالمی سطح پر سفری پابندیاں جو اس وقت نہایت سخت ہو چکی ہیں، تب تک ان میں رخنوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ خادم آ گیا اور یہاں موجود ایسے غیر قامی ہم کاروں کو حتی الوسع گھروں کو روزانہ کر دیا جن کی اشد ضرورت نہ تھی۔

سو احوال یہ ہے کہ اگرچہ اب تک شام میں رسمی طور پر کورونا کے ایک بھی مریض کا اعلان نہیں ہوا ہے، لیکن یہ خدشہ قرین قیاس ہے کہ جنگ زدہ ملک میں اطلاعات کے نظام کی ٹوٹ پھوٹ اور خصوصاً شمال مغرب اور شمال مشرق میں مہاجرین کی آمدورفت کے سبب درست اندازہ کسی کو نہیں۔ دوسرے یہ کہ ملک پہلے ہی مغربی ممالک کی عائد کردہ اقتصادی پابندیوں تلے سسک رہا ہے اور کچھ علاقے حکومتی عمل داری سے اب تک باہر ہیں، سو یہ ناگزیر آفت جب بھی ٹوٹی، اس کا مقابلہ ایک بہت کٹھن کام ہوگا۔

عالمی ادارہ صحت کے مقامی دفتر نے اس آفت کو ایک طبی مسئلے کے طور پر دیکھا اور اس کے

تدارک کے لیے صدفی صد طبی ایمر جنسی کی طرز کے اقدامات تجویز کیے۔ ان میں سے چند پر فوری عمل درآمد مثلاً غیر ضروری سفر پر پابندی، ملک میں داخل ہونے والوں کی کڑی جانچ پڑتال اور ان میں مشتبہ مریضوں یا وائرس برداروں کو قرنطینہ کے مراکز میں منتقل کرنا روبہ عمل لائے جا چکے تھے۔ تعلیمی ادارے تو پہلے ہی بند کر دیے گئے تھے لیکن گزشتہ ہفتے سے تمام تھیٹر، سینما گھر، ریستوران، مے خانے، چائے خانے، عوامی اجتماعات، بشمول ہر قسم کے مذہبی اکٹھ بھی بند کر دیے گئے ہیں۔ بڑی بسیں بھی کھڑی کر دی گئی ہیں اور سرکاری دفاتر میں کام بند کر دیا گیا ہے۔

ان اقدامات کے پہلو بہ پہلو کچھ دیگر ماہرین نے توجہ دلائی کہ یہ مسئلہ اپنی بنیاد میں تو طبی ہے لیکن ان کے مجموعی اثرات زندگی کے تمام شعبوں، سماج، معیشت، عوامی خدمات اور لوگوں کی ذہنی حالت پر بھی بہت گمبھیر ہوں گے۔ مثلاً دیہاڑی دار مزدور ہزاروں کی تعداد میں یک بیک بے روزگار ہو گئے ہیں۔ طعام گاہوں کو کچے راشن کی رسد کے کاروبار سے وابستہ لوگ، کسان، مویشی اور مرغیاں پالنے والے، سب کی معاشی سرگرمی رک گئی ہے۔

اس کے نتیجے میں بازار میں دیگر کاروباری اشیاء اور خدمات کی طلب بھی نیچے آ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ بہت کٹھن تھا لیکن حکومت نے اس نقصان کو انسانی جانوں کے ممکنہ اتلاف کے مقابلے قابل قبول قرار دیا۔ اب ان درج بالا اثرات کی شدت کم کرنے کے لیے اقدامات کو عملی شکل دینے کے لیے سوچ بچار اور مشورے جاری ہیں۔

اس خادم کی پیشہ ورانہ زندگی کے معمول پر پہلا اثر تو یہ پڑا ہے کہ اگلے اتوار سے دفتر دو ہفتے کے لیے بند کر کے ہم کاروں کو گھر سے کام کرنے کی ہدایت جاری کر دی گئی ہے۔ ہر افسر شاہی کے مانند ہمارے ادارے میں بھی کاغذی کارروائی اور نتیجے میں کاغذ کا استعمال بے تحاشا ہے۔ ہمارے افغان دوست زبیر عزت کئی ماہ ''بے کاغذ دفتر'' کی مہم چلا رہے تھے کہ دھندے کو مکمل طور پر ''آن لائن'' کرنا قطعی ممکن ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لوگوں کے لیے اپنے لگے بندھے معمول کو یکسر ترک کرنا مشکل ہوتا ہے۔

ہوتا یہ تھا کہ کوئی دستاویز برقیاتی ڈاک میں موصول ہوئی اور ابھی اسے پڑھا جا رہا ہوتا کہ کوئی بے صبر ہم کار اسے کاغذ پر بھی چھاپ کر لے آتا۔ سو اس پُرآشوب ماحول میں ایک مثبت امکان یہ نکلا ہے کہ اب بے کاغذ کارروائی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ دستخط بھی آن لائن ہوں گے اور ''نوٹ پورشن'' بھی آن لائن لکھے جائیں گے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہتا ہے تو ادارہ جاتی

کارکردگی کا ایک منفرد اور خوش گوار نمونہ سامنے آسکتا ہے۔

بے گھری اور باورچی خانے کی سہولت تک رسائی نہ ہونے کے سبب یہ خادم اور دیگر غیر ملکی ساتھی حضرات اکبر الہ آبادی کے مہذب لوگوں کے گنوائے گئے اوصاف میں سے پہلے ''کٹی عمر ہوٹلوں میں'' پر کاربند رہنے پر مجبور تھے۔ طعام گاہیں بند ہونے کے سبب وہ آسرا بھی لد گیا۔ اب لگتا ہے کہ تاجکستان کی بولی میں ''تیز تیار'' یعنی فاسٹ فوڈ پر تکیہ کرنا پڑے گا۔ اس بھرے پُرے شہر کے ہر اُس حصے میں جہاں کل تک کھوے سے کھوا چھل رہا تھا، ویسے حالات ہیں جیسا کہ مرحوم حبیب جالب نے ضیاء الحق کے ریفرنڈم کے دن کی تصویر کشی کی ہے ''شہر میں ہو کا سا عالم تھا''۔

اس خادم کی قیام گاہ کی واحد کھڑکی ایک نہایت دیدہ زیب چمن کی سمت کھلتی ہے۔ وہاں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ خصوصاً جمعے اور سنیچر کو لوگ باگ اہلِ خانہ سمیت قریبی ریستوران سے شاورما خرید کر یہاں آن بیٹھتے تھے۔ بچے کلیلیں کرتے تھے اور پھیری پر کافی، چائے سگریٹ بیچنے والوں کی لین ڈوری لگی رہتی تھی۔ لازمی فوجی خدمت سے چھٹی پر آئے ہوئے سپاہی بھی بیویوں یا محبوباؤں سے ملاقات کے لیے اس پُرفضا گنج کا انتخاب کرتے تھے۔

سردی گرمی یہ معمول جاری رہتا تھا۔ اب دو روز سے یہ بھی ویران پڑا ہے۔ بازار میں نقاب پوش چہرے تو کم لیکن دستانہ پوش ہاتھ ہر دکان اور ادارے میں نظر آتے ہیں اور گاہکوں اور اہل کاروں کے لیے جابجا ہاتھ پاک کرنے والے محلول کی شیشیاں دھری ہیں۔ اب تک یورپ اور امریکہ کے بعض علاقوں کے برعکس، گھبراہٹ میں زیادہ سے زیادہ مال خرید کر ذخیرہ کرنے کے مناظر نظر نہیں آئی ہیں اور قیمتیں بھی چنداں نہیں بڑھی ہیں۔ آگے کا کہا نہیں جاسکتا۔ بازار میں جاتے وقت البتہ یہ امر اطمینان بخش لگا کہ یہ افتاد شیخ سعدی کی بیان کردہ صورت حال تک نہیں پہنچی جس کا ثبوت ہر عمر کے مرد و زن کا جوڑوں کی شکل میں جابجا دکھائی دینا ہے۔

یہ آس پاس چھائی خاموشی ماہرین کے مطابق لغوی طور پر ایک طوفان کا پیش خیمہ ہے جو لہٰذا ہر جہت میں عالمی ہے۔ اہلِ وطن کے لیے نیک تمنائیں اور ان سے باقی دنیا کے لیے دعا کی استدعا ہے۔

۴ اپریل ۲۰۲۰ء

احباب کو گلہ رہتا ہے کہ یہ خادم اردو املا میں جزوی طور پر شکیل عادل زادہ صاحب اور برادرم ظفر عمران کے رنگ میں رنگتا جا رہا ہے۔ سو چونکیے مت۔ عنوان اطہر نفیس مرحوم کے مشہور مصرع میں سہوِ کتابت کا غماز نہیں ہے بلکہ ہماری عربی دانی اور ہیچ مدانی کے تازہ ترین پڑاؤ کا عکاس ہے۔ دیگر دنیا کے مانند سوریہ بھی کورونا کی وبا کی روک تھام کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات کے اثرات جھیل رہا ہے۔ اب تک یہاں سرکاری طور پر انیس افراد میں مرض کی تصدیق ہوئی ہے جن میں سے چار صحت یاب ہو چکے ہیں اور دو وفات پا گئے ہیں، لیکن جنگ کی افراتفری کے سبب پھیلاؤ کا درست اندازہ کسی کو نہیں ہے اور حکومتی عمل داری سے باہر کے علاقوں کی صورت حال تو مکمل طور پر پردہ اخفاء میں ہے۔ کھانے پینے، کریانہ اور ادویات کی دکانوں کے سوا تمام کاروبار اور سب تعلیمی ادارے، تھیٹر، سینما، عوامی پارک، عبادت گاہیں تو پہلے ہی بند کر دیے گئے تھے۔ دو ہفتے سے ملک بھر میں شام چھے سے صبح چھے تک اور جمعہ اور سنیچر کو دوپہر بارہ سے اگلے روز صبح چھے بجے تک کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔

اس خادم سمیت تمام غیر ملکی اہل کاران ابتدا سے ہی سرکار کی جانب سے مقرر کردہ ایک پنج ستارہ ہوٹل میں رہنے پر مجبور تھے، لیکن وبا سے پہلے کھانے کے لیے باہر کے ریستورانوں کا رُخ کیا کرتے تھے۔ شروع کے کچھ دن تو کھانا باہر سے لاتے رہے لیکن اب اس چھے بجے شام کی بندش کے سبب وہ سہارا بھی تقریباً اٹھ گیا۔ سو کچھ ہم کار بازار سے بجلی کے چولہے، دیگچیاں، مسالے وغیرہ لے آئے ہیں اور کمروں میں فنِ طباخی کی داد دیتے ہیں۔

عام حالات میں تو ہوٹل میں اس عمل کی ممانعت ہے لیکن ان خصوصی حالت کے تحت یہ لوگ بھی اس جانب سے فی الحال غضِ بصر پر کاربند ہیں۔ ہماری پاکستانی ہم کار بی بی حرا ہاشمی کا حال ہی میں یہاں تقرر ہوا تھا اور ان کے آتے ہی صورت حال دگرگوں ہوگئی۔ انہوں نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کچھ بندوبست کر لیا تھا، سو یہ خادم ان کے ساتھ مل جل کر پیٹ پوجا کا کچھ بندوبست کر ہی لیتا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ مراسلے میں عرض کیا تھا، اس خادم کے کمرے کی واحد کھڑکی جانب مشرق ایک دیدہ زیب عوامی پارک پر کھلتی ہے۔ دفتر بند کرکے ہم کاروں کو گھر سے ہی کام کرنے کی ہدایت کے نتیجے میں اس خادم کا ربط دن اور رات کے اکثر اوقات میں اس شاہجہانی روزن کی راہ سے باہر کی دنیا سے ہوتا ہے۔ کرفیو کھلنے کے اوقات میں بھی پارک کو چاروں جانب پلاسٹک کا فیتہ لگا کر عوام کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اس کی گھاس کو بلدیہ کے اہل کاران جھاڑ جھنکار نہیں بننے اور سبزہ و شجر کی تراش خراش باقاعدہ جاری رہتی ہے لیکن ویرانی کے سبب اہل دمشق کی زندگی اور عشق پیشگی کے نظاروں کی گہما گہمی مفقود ہوگئی ہے۔

دن کے اوقات میں کبھی کبھی راشن لینے اور کبھی سرکاری دفاتر میں اجلاسوں کے لیے جانا ہوتا ہے۔ اکثر جگہ، مثلاً سرکاری تنوروں پر لوگوں کو مناسب فاصلے سے قطار بناتے دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے۔ دوسری جانب جب ہزاروں لوگوں کا خیال آتا ہے جو کاروبار، مزدوری اور ملازمتوں کی بندش کے سبب بے روزگار ہوگئے ہیں، تو تشویش گھیر لیتی ہے۔ حکومت نے جنگ زدگی اور مغربی ممالک کی لگائی گئی یکطرفہ اقتصادی پابندیوں کے سبب مالی مشکلات کے پیش نظر کھانے پینے کی اشیاء، بجلی اور ایندھن پر سالوں سے جاری زر اعانت یعنی سبسڈی کو کم یا ختم کرنے کا عندیہ اس سال کے شروع میں دیا تھا۔ لیکن ان حالات میں اس ارادے پر نظر ثانی کرکے اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یقیناً ایسے حالات میں بہت سوں کو بھوک سے بچانے میں یہ ایک اہم عامل ہے۔

عنوان میں مذکور لفظیاتی نکتے کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے۔ کورونا کے معاملات پر نظر رکھنے والے احباب واقف ہوں گے کہ جن لوگوں میں اس مرض کا شبہ پایا جائے انہیں قرنطینہ یا تنہائی میں رہنے کی سفارش کی جاتی ہے اور جن لوگوں کو سانس لینے میں دشواری ہو یا مرض کی دیگر علامات زور پکڑ جائیں انہیں ''آئسولیشن وارڈز'' میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہاں وزارت صحت کے ساتھ اجلاسوں میں جدید عربی کا ایک اور پہلو آشکار ہوا۔ وہ یہ کہ قرنطینہ کے لیے مختص کی گئی عمارتوں کو ''مرکز حجز'' کہا جاتا ہے۔

اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ ہمارے فہم کے مطابق تو حجر پتھر کو کہتے ہیں۔ آس پاس کوئی ایسا دوست بھی نہ ملا جو لسانیاتی اشتقاق میں دست رس ہو۔ ذرا سا اشارہ گوگل سے ملا لیکن تسلی نہیں ہوئی چنانچہ سوشل میڈیا کے راستے ممتاز عالم دین اور ماہر عربی مولانا عمار خان ناصر سے رہ نمائی چاہی تو تصدیق ہوئی کہ کلاسیکی عربی میں ''ح'' کے نیچے زیر اور جیم پر جزم کے ساتھ یہ لفظ ماں کی گود یا

محفوظ علاقے کے معنی دیتا ہے۔

آئسولیشن وارڈ کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاح اس سے بھی زیادہ دل چسپ نکلی۔ یہاں انہیں ''مراکزِ عزل'' کہتے ہیں۔ یہ لفظ اس خادم نے فقہ کی کتب میں دیکھ رکھا تھا اور وہاں یہ ''صرف بالغان کے لیے'' والے ابواب میں مذکور تھا۔ اس کے علاوہ اسلام کی تاریخ کے اولین عقلیت پسند مکتبہ فکر کے نام میں بھی اس کا پرتو تھا، لیکن ان معنوں میں اس کا استعمال پہلی بار دیکھا۔ یہ سطور لکھتے وقت اچانک ذہن میں انشا جی کا شعر گونجا تو بات مزید صاف ہوگئی۔ اس خادم کی طبیعت کا تو اس غزل سے قدیمی تعلق ہے اور وبا پھیلنے سے کہیں پہلے کا ہے، آپ بھی ان اشعار کو اپنے موجودہ حالت پر منطبق کر کے اس کا لطف اٹھایئے۔

انشا کہو مزاج مبارک کو ان دنوں
دنیا خوش آرہی کہ جانی اداس ہو

نبھنے لگی ہے بلدۂ خوباں کی خاک سے
یا دل کی وحشتیں ہیں پرانی اداس ہو

کل بزمِ دوستاں میں تمہارا ہی ذکر تھا
ہم نے سنی تمہاری کہانی اداس ہو

عزلت نشینی، خلق گریزی، فسردگی
بیتیں بہ طرزِ میر سنانی اداس ہو

دیکھو اب بھی جی کو محبت سے پھیر کے
ایسی بھی کیا کسی کی جوانی اداس ہو

انیس ہارون

ڈائری

۱۴ مارچ ۲۰۲۰ء

کورونا کورونا کورونا۔ دنیا کے حواسوں پر سوار ہے۔ شروع میں یہ سمجھا گیا یہ چینیوں کے کوئی خاص چمگاڈر کھانے کی وجہ سے ہوئے اور وہ وہاں تک ہی رہے گا۔ یہ دسمبر کے وسط میں ہوا اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اسی خطے تک محدود رہے گا جہاں چمگاڈریں۔ کتے، بلیاں، بندر، سانپ وغیرہ کھائے جاتے ہیں، مسلمان تو لمبی تان کر ہو گئے کہ ہمارا کیا تعلق ان گندی چیزوں سے۔

ہم تو سب سے ارفع ہیں، فتویٰ بھی آنے لگے کہ ہم حرام نہ کھانے والوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ پاکستان میں تو سوچا بھی نہیں گیا اور زندگی معمول کے مطابق بھرپور طریقے سے چلتی رہی بلکہ پوری گہماگہمی سے دوڑتی رہی۔ دسمبر میں اسکول کالجوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں، موسم بھی ٹھنڈا ہوتا ہے۔

باہر سے پاکستانی اپنے ملک آتے ہیں۔ خاندان اور دوستوں میں کوئی نہ کوئی شادی ضروری ہوتی ہے۔ شادیاں تو دسمبر جنوری میں اتنی ہوتی ہیں کہ لگتا ہے اس بار کوئی کنوارہ نہ بچے گا۔ مگر ماشا اللہ اتنی برکت ہے کہ اگلے سال ایک نئی کھیپ تیار ہو جاتی ہے اور ماں باپ اتنے خوشی سے تیاری میں لگ جاتے ہیں کہ جیسے دنیا میں کوئی انوکھا واقعہ ہونے جارہا ہے۔

ہمارے گھر تو بہت رونق ہوتی ہے کیونکہ سارے خاندان کے بچے آتے ہیں۔ اس بار تو شادیاں جلد ہی شروع ہو گئی تھیں۔ میری دوست حمیرا پریشان ہو رہی تھی کہ اس کی بیٹی لیلیٰ کا نکاح ۱۴ نومبر کو تھا۔ اور اُس کا گھر تیار نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا یہاں کر لو یہ گھر بھی تو تمہارا ہے۔ حمیرا ہماری آرکیٹکٹ بھی ہے۔ میں نے اور اُس نے مل کر بڑی محنت سے ۸۴۔۸۵ میں یہ گھر بنایا تھا۔

لیلیٰ اُن ہی دنوں میں پیدا ہونے والی تھی۔ ”تم ہی تو سب سے پہلے لیلیٰ کو دیکھنے آئی تھیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نکاح میں نہ شریک ہو“ حمیرا نے یہ کہہ کر میری دوسری دوست نگار کے بیٹے بلال کی شادی میں لاہور جانے کا راستہ تو بند کر دیا تھا جو ۱۶ر نومبر کو ہی ہونی تھی ار وہ بھی نجم اور جگنو کی بیٹی سے جو ہمارے پُرانے دوست ہیں۔

لیلیٰ کا نکاح ہمارے ہی گھر ہونا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے گھر سے رنگ روغن کرنے والوں کو بھگایا اور خیر سے ایک اچھی تقریب ہوگئی۔

پھر تو باہر سے رشتہ داروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہماری پیاری نواسی شانزے کیش ادی ہونے والی تھی دسمبر میں، پہلے نفیس ناصر آئے آسٹریلیاں سے، پھر عاشم، عارف، عامر، اور عرفان آگئے، نیٹیلی بھی آئی عرفان کی دوست پاکستان شادی دیکھنے، اُسی دن ہمارے گھر میں ہی شانزے کا مایوں تھا۔

اتوار ۲۲ر دسمبر کو، پھر تو وہ دھما چوکڑی مچی کہ کب جنوری آگیا پتہ ہی نہیں چلا کورونا کا کہیں سایہ تک نہیں تھا۔ سارے مہمان خیر وخوبی سے رخصت ہوئے اور زندگی معمول پر آگئی۔ ۵ فروری کو نادیہ آگئیں

مارچ بہت بری خبر لے کر آیا۔ ایران میں قم کے شہر میں کورونا وائرس اتنی تیزی سے پھیلا کہ دنیا شاک میں رہ گئی ایران سے واپس آنے والے زائرین نے پاکستان میں خطرے کا الارم بجا دیا۔ اس وقت تک اٹلی، جنوبی کوریا، یورپ کے کئی ملکوں اور امریکہ، کینیڈا میں بھی خطرناک صورت حال پیدا ہوچکی تھی۔ اٹلی اور ایران میں کورونا اتنی تیزی سے پھیلا کہ لوگ چین اور جنوبی امریکہ کو بھول گئے اور خوفناک خبریں دنیا سے آنے لگیں۔

اب جب میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں تو اٹلی پورے کا پورا لاک ڈاؤن ہوچکا ہے۔ پاکستان نے بھی اپنی بیرونی سرحدیں بند کر دی ہیں۔ سندھ بھر میں بہت زیادہ احتیاطی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں کیونکہ ایران کے باڈر تفتان سے آنے والوں نے سکھر، لاڑکانہ اور کراچی میں کورونا کی ابتدا کر دی تھی۔

مریضوں کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہوگئی تھی۔ کراچی، سکھ کے علاوہ بلوچستان، مردان، پنجاب میں بھی کیسز شروع ہوئے تو سماجی فاصلے social distancing کی بات ہونے لگی کہ

لوگ میل جول زیادہ نہ کریں، ہاتھ نہ ملائیں، گلے نہ ملیں، مجمع اکٹھا نہ ہو۔ چلو بھئی دفع ۱۴۴ لگا دو۔ ویسے بھی یہ ہماری انتظامیہ کا محبوب سیکشن ہے۔ کسی بھی قسم کا احتجاج روکنے کا، خواہ وہ طلباء ہوں، استاد ہوں، صحافی ہوں، انہیں خلاف ورزی پر گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔ مار پیٹ اور پانی کی توپوں سے دھلائی بھی ہوتی ہے۔

بھلا ہو سندھ حکومت کا جو خم ٹھونک کر میدان میں آگئی اور وزیر اعلیٰ روز بیانات دینے لگے، بہت خطرناک وائرس ہے۔ ہمیں اپنے گھروں میں محدود رہنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے لوگ بڑے لاپروہ۔ اللہ توکل والے۔ اپنے اونٹ جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں پیر میں رسی بھی نہیں باندھتے، واہ جی۔ کوئی ضرورت نہیں اللہ مالک ہے، اللہ تو مالک ہے مگر جو اُس نے ہدایت دی ہے وہ بھی تو سُن لو۔ اپنا سارا بوجھ اللہ پر کیوں ڈالتے ہو، نہیں جی ہم تو مسلمان ہیں ہمیں کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور جب ہو جائے تو قسمت پر ڈال دو۔ کتنا آسان ہے اپنی کاہلی اور بے علمی کے پیچھے چھپنا۔ اپنے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں لینا، غربت ہو تو قسمت، امارات ہو، تو قسمت بس تقدیر میں جو ہے وہ تو ہوگا ہی۔ سکھایا بھی یہی جاتا ہے۔

خواب سے جاگتا ہے محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے حکمران کی ساحری

۲۱ مارچ

آج تو سندھ حکومت نے تین دن سب کی چھٹی کر کے گھروں میں رہنے کا کہہ دیا، مارکیٹس، بازار، شاپنگ مال، سینما گھر، ہوٹل، ریسٹورنٹ سب بند کر دیئے گئے۔

صرف کھانے پینے اور دوا کی دوکانیں کُھلی رہیں گی۔ باہر سے کچھ کھانا ہو تو آرڈر کر کے منگوائیں۔ بہت سارے منچلے پھر بھی نہ مانے سنا ہے کہ منع کرنے کے باوجود رائے ونڈ کے اجتماعات بھی ہوئے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ اکٹھے ہوئے، شیر، بکری نے ایک ہی گھاٹ سے پانی کیا اور وضو بھی کیا۔

۲۲ مارچ

ظاہر ہے کورونا وائرس کا گراف تیزی سے بڑھ گیا۔ مریضوں کی تعداد چھ سو سے بڑھ گئی۔ تین اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ایک کراچی میں ۷۷ سالہ کورونا کا مریض جاں بحق ہوا تو خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ کیونکہ وہ کہیں سے سفر کرکے نہیں ایا تھا۔ دو مردان میں جان سے گزر گئے۔ حلقہ تنگ ہونے لگا۔ کورونا سے پہلی موت ۲۶ فروری کو مردان میں ہوئی تھی۔

اچانک سکھر قرنطینہ میں رکھے گئے زائرین سڑکوں پر نکل آئے ''یا حسین، یا حسین'' ناقص سہولیات پر ماتم ہونے لگا۔ ہم تو مجلس بھی کریں گے غیر ذمہ داری کی حد ہوگئی۔ یہ امریکہ کی سازش ہے ہمیں روکنے کی وغیرہ وغیرہ، بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔

دوسری طرف ایران اور اٹلی کا حال بُرا تھا۔ خصوصاً اٹلی میں مرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ایران میں بھی ہزاروں سے زیادہ ہی ہوگئی۔ دنیا کے ۱۸۶ ملکوں میں کونا پھیل گیا۔ یا اللہ یہ کیا آفت ہے۔ کہیں رُکے گا بھی یا نہیں۔ کیا قیامت کی ابتدا ہے یہ۔ کا ہماری زندگیاں اب ختم ہونے کو ہیں۔ انان کی پوری نسل مٹ جائے گی؟ نہ جانے کیسے کیسے خیالات دل میں گھر کرنے لگے ہول آنے لگا۔

میرے بچے بھی دور ہیں، عدنان نوما ٹورنٹو میں ہیں۔ میرا بھائی اُس کے بچے بھی وہیں، نادیہ ڈینور میں ہیں۔ عرفان ڈاکٹر ہیں۔ اُن کی زیادہ فکر رہتی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹروں کی ڈیوٹی بہت سخت ہے۔

سارا وقت اسپتال میں رہنا ہوتا ہے۔ ۱۰۰ طرح سے انفیکشن ہوتے ہیں۔ بس اللہ میرے بیٹے کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میری بہن نفیس اور اُس کے بچے آسٹریلیا میں ہیں۔ وہاں بھی کورونا ہے۔ ساری دنیا ہی وبا کی زد میں ہے کہیں بھی کوئی بھی محفوظ نہیں۔

وزیر اعلیٰ سندھ نے آج رات سے ۱۵ دن کی بندش کا اعلان کر دیا ہے۔ رینجرز، پولیس سب اس بندش کی نگرانی کریں گے کہ کوئی شخص بغیر کسی ضرورت کے باہر نہ نکلے۔ اپنے ساتھ شناختی کارڈ رکھے، بتائے کہ کیا ضروری کام ہے ورنہ سزا ملے گی۔ گرفتاری اور جرمانہ ہوسکتا ہے۔ منچلے تو شاید پھر بھی نہ باز آئیں جہالت کی کوئی حد نہیں۔ ہاں بیچارے جو روز کی دھاڑی کمانے والے ہیں

اُن کا کیا ہوگا۔
سندھ حکومت نے بہت سارے اقدامات کا ذکر کیا ہے۔ اللہ کرے پورے ہوں چارہ کوئی نہیں ہے۔ لاک ڈاؤن کے لیے علاوہ عمران خان کی سمجھ میں تو کچھ آہی نہیں رہا۔ کوئی فیصلے کی ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ہمیں کسی کے ہاتھوں پھنسا دیا احمقوں نے، کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ نہ کوئی پالیسی بنا سکتے ہیں۔
ہاں ایک اور مزیدار بات ہوئی، مظہر نے پلان بنایا تھا کہ آج سلیم عاصمی کے گھر چوکڑی جمے گی برنچ پر، اب کا ہوگا، ہلڈا اور ہی نے مظہر کو تیار کر لیا کہ فی الحال پروگرام ملتوی کر دیں۔ سب ماشا اللہ جوان ہیں اپنی عمر کا خیال کر لیں۔ کورونا ہے کورونا، تو خیر وہ پروگرام کینسل ہوا۔
ٹی وی پر، اخباروں میں ہر جگہ بس کورونا ہے۔ طبیعت کچھ اوبھنے لگی ہے۔ کورونا کے ذکر سے، بس کتابیں ہی اچھا سہارا ہیں، یا کچھ میوزک سُن لیں، ہاں فلمیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ مُنی باہر کچھ سامان لینے جارہی تھی اس سے کہہ دیا کہ کچھ فلمیں لے آؤ۔ وہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتی پھری اور ایک جگہ جتنی فلمیں ملیں تیس چالیس اردو، انگریزی سب اٹھا لائی، چلو کچھ وقت زبردستی کاٹا جاتا ہے۔
اُس میں کوئی مزا نہیں آتا۔ وقت وہ اچھا گزرتا ہے جو اپنی مرضی سے گزارا جائے۔ جس میں کوئی نظم وضبط ہو اور ایک معمول سے ہٹ کر اپنی پسند کی چیز کرنے کا آسرا بھی، کتنا مزا آتا ہے جب کام سے تھک کر سوئیں۔ جب فرصت ملے فلم دیکھیں، اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ زبردستی کے آرام یا بیکاری میں کوئی مزہ نہیں، اور پھر جو ایک خوف اس وبا کا سر پر سوا ہے، وہ بھی سر اٹھاتا رہتا ہے۔
مجھے تو سب کچھ بہت ہی عجیب سا لگتا ہے، جیسے یہ اصل میں وہ دنیا نہ ہو جس میں ہم رہتے آئے ہیں، ویران سڑکیں، ہر طرف ایک خالی پن، بازاروں پر تالے، لوگوں کے پھیکی پھیکی ہنسی، باتیں ایسی کہ جیسے دوسروں کو تسلی دے رہے ہوں مگر خود کو یقین نہیں۔

۲۳ مارچ

دنیا جیسے تھم کر رہ گئی ہے، گھڑی کی سوئی تک تک کرتی ہے مگر وقت آگے نہیں گزرتا، بس گنتی رہ گئی ہے، آج پاکستان میں مریضوں کی تعداد ۶۴۹ ہوگئی ہے، اٹلی میں چار ہزار سے زیادہ لوگ مر گئے، امریکہ میں بھی لاک ڈاؤن ہوگیا، دنیا کے امیر ترین ملک میں بھی ساری سرگرمیاں رُک گئیں، خوف کا لبادہ اوڑھے آسمان نہ چڑاتا ہے، اور پھینکیں کمندیں، اپنی زمین کو سنبھال نہ سکے، تسخیر کائنات کے زُعم میں ہو، اپنا حشر تو دیکھو، دولت کے پہاڑ کھڑے کر دینے والے بھی محفوظ نہیں ہیں، زمین کہیں پناہ دینے تیار نہیں، صدیوں کا قرض چکانا ہے حضرت انسان سے، کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ ایٹم بم، خطرناک ترین مہلک ہتھیار، نپام بم اور مُہلک بائیولوجیکل ہتھیار بنائے خود الزام صدام حسین پر جو خود ایک کارندہ تھا۔ ہیروشیما، ناگاساکی سے دل نہیں بھرا، تباہ کر دیا ماحول کو، اوزون لیئر میں سوراخ ڈال دیا، جہاں پہنچے تباہی کر دی، یہ اشرف المخلوقات تھے جو ساری مخلوق کو مٹانے کے درپے تھے۔ اپنے آپ پر نازاں ان زمینی خداؤں کی بے بسی کورونا کے سامنے دیکھیے۔

۲۴ مارچ

چار دن ہوگئے گھر سے قدم باہر نکالے، دو دن تو بڑی کتابیں وغیرہ صاف کیں ترتیب دینے کی کوشش کی، ہارون کی لائبریری ٹھیک کی اور اپنے کمرے کی کتابیں درست کیں اب وہ بھی اچھا نہیں لگ رہا، مزا نہیں آرہا کسی چیز میں۔

موسم بہت اچھا ہے، رم جھم ہو رہی ہے، ہمارے مور بھی خوشی سے ناچ رہے تھے، لیکن طبیعت اندر سے اُداس ہے، فون پر ہی کچھ دوستوں سے بات ہو جاتی ہے، باہر جانے کا کوئی سین نہیں، زیادہ سے زیادہ جنرل اسٹور چلے جاؤ، سمندر پر جانے پر بھی پابندی ہے۔

بچے بہت یاد آتے ہیں، دل چاہتا ہے کہ اُڑ کر اُن کے پاس پہنچ جاؤں یا انہیں یہاں لے آؤں۔ وقت اچھا ہو یا بُرا، جی چاہتا ہے اپنے سب ساتھ ہوں۔

نعمان کی شادی ہوگئی جانے کا سوچ بھی نہ سکے، آسٹریلیا بھی کورونا سے متاثر ہو چکا ہے۔ پھر بھی شادی کی ایک چھوٹی موٹی تقریب کرڈالی بچوں نے۔ مبارکباد ہی دے سکتے تھے۔

مجھے لگتا ہے کہکورونا کے ختم ہونے تک دُنیا بہت بدل چکی ہوگی۔ ایک بہت بڑی تبدیلی آئے گی۔ اچھی یا بُری۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

لوگوں کو بچا لیں یا معیشت سنبھال لیں حکمران اسی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ چُھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، کٹے گا خربوزہ ہی۔ انسان نہ ہوا خربوزہ ہوگیا۔

شام کا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ لان میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں، ہرے بھرے درختوں کی فضا اچھی لگتی ہے۔ رومیو، جیولیٹ کی سیٹیاں، چڑیوں کی چہچہاہٹ۔ آسکر، اروڈا کی مستیاں بھلی لگتی ہیں، ایلمو پاس سب دیکھتا رہتا ہے اور اس چکر میں رہتے ہیں کہ کچھ کھانے کو مل جائے۔

آج دو خبروں نے دل بہت دکھایا، ایک تو پیسوں کے جھگڑے میں بھائی نے بھائی کو مار ڈالا، دوسرے کمبر کے ایک گاؤں میں وڈیرے کے بیٹوں نے کسان کے گھر میں گھس کر اُس کی بیوی کو بہت مارا، چہرے بالکل نیلا، کالا ہوگیا، بال کاٹ ڈالے اور پھر گھر کو آگ لگا دی۔

اُف ناقابل بیان تکلیف ہوئی، پولیس کو رپورٹ کردی، پکڑے تو گئے مگر شاید چھوٹ بھی جائیں گے۔ ایسے لوگوں کو کرونا کچھ کورونا۔ ان ظالموں سے نجات نہیں مل سکتی، اتنے نازک وقت میں بھی یہ اپنی شیطانی کاموں سے باز نہیں آتے۔ انسان ہی سب سے بڑا درندہ ہے۔

۲۵ مارچ

آج عاصمی کا فون آیا ”بھئی جب قید سے نکلو تو حیدر آبادی کھچڑی کھلانا۔ ضرور کھلا دیں گے تم نے ابھی تک کھلائی کیوں نہیں؟ معقول سوال تھا اور جواب بھی معقول، وہ ہم دن میں کھاتے ہیں اور آپ لوگوں کا وقت رات کا ہوتا ہے۔

حیدر آبادی کھچڑی کوئی خاص نہیں ہوتی لیکن اُس کے لوازمات خاص ہوتے ہیں۔ ہم عموماً ناشتے میں یہ اہتمام کرتے ہیں۔ کھچڑی تل کی چٹنی، پاپڑ، قیمہ، اچار، انڈے، سب کچھ مل کر ذائقہ دیتے ہیں۔ اچھا وقت آئے گا تو کھلا دینگے عاصمی کو کسی دن۔ وہ وقت کب آئے گا کوئی پتہ نہیں۔

۲۶ مارچ

آج بندش کا پانچواں دن ہے۔ اب مریضوں کی تعداد پاکستان میں ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے، social distancing انسانوں کو سوشل اینیمل سے اٹھا کر آئی سولیشن میں پھینک دیا ہے۔
آج شین سے بات ہوئی۔ بتا رہی تھی کہ عطیہ اور ابرو کہیں جا رہے تھے۔ ایک پولیس والے نے گاڑی روکی اور ابرو سے کہا کہ آپ پیچھے بیٹھیں۔ ہم دونوں خوب ہنسے۔ ہاں بھئی میاں بیوی کو بھی فاصلہ رکھنا چاہیے۔
ایک ویڈیو کلپ میں دکھایا گیا تھا کہ روم کی گلیوں میں کاروں سے چار پانچ پولیس والے اترتے ہیں ایک گٹار بجاتا ہے۔ کوئی گانا گاتا ہے، دو تین ناچتے کودتے ہیں۔ کھڑکیوں سے محصور لوگ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ تالیاں بجاتے ہیں، اور وہ چل پڑے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے ہلہ گلہ ہو جاتا ہے۔ خیال آیا ایس ایم شاہد کو یہی کرنا چاہیے۔ ہارمونیم گلے میں ڈال کر دوستوں کے گھروں کے سامنے گائیں بجائیں اور چل پڑیں۔ واہ بھئی کچھ اپنے دوستوں کا خیال رکھیں۔
شین کو زیادہ تکلیف نہیں ہے۔ وہ ویسے ہی سماجی فاصلوں کی عادی ہے زیادہ میل جول یا کسی کے ساتھ دینے کی عادت تو ویسے بھی نہیں تھی۔ یہ میں ہلڈا سے دو تین دن پہلے کہہ رہی تھی۔ شین نے بالکل یہی کہا کہ مجھے تو زیادہ پریشانی نہیں ہے۔ خوب ہے بھئی۔ ہم تو ملے جلے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

۲۹ مارچ

آج کچھ لکھنے کا جی نہیں ہو رہا اتوار ہے مگر روز جیسا ہے۔ چھٹی کا مزا ہی باقی نہیں رہا کہ روز ہی چھٹی ہے۔ انسان بھی کتنا متلون مزاج ہے۔ یکسانیت سے جلدی اُکتا جاتا ہے۔ دوستوں سے ملنے کو جی کرتا ہے۔ کام کرنے دفتر جانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ کیا کہ گھر ہی بیٹھو۔
نہ بیٹھا گیا گھر۔ ایلمو کے ساتھ باہر گئی۔ سیف اللہ بڑی مستعدی کے ساتھ ماسک لگائے

ہیں۔ ایک میں بھی چڑھایا اور نکل پڑی۔ گاڑی میں پٹرول ڈلوایا اور پھر پھل لینے چلی گئی۔ کوئی بارہ دن بعد گھر سے نکلی تھی۔ عجیب سا لگ رہا تھا۔ سڑکیں ویران تھیں۔ کچھ گاڑیاں، اسکوٹر چل رہے تھے۔ کچھ رکشہ والے سواریوں کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔

پھل لینے رُکی تو ایک پھیری والا چنے بیچ رہا تھا۔ میرے پاس بھی آیا۔ میں نے منع کر دیا تو اُس کا منی اُتر گیا مگر وہ قریب ہی کھڑا اُس کا سُتا ہوا چہرہ ملتجی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں چپکے سے کچھ پیسے رکھ دیے وہ خوش ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر پیسے جیب میں ڈال لئے اور مطمئن ہو کر چل پڑا کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ آخر غریب کی عزتِ نفس بھی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے اُس نے زندگی میں پہلی دفعہ ہی خیرات لی ہو۔ جانے کیا گزر گئی اُس پر۔ دِلوں کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

رات نادیہ کا فون آیا۔ تسلی دے رہی تھی کہ ڈینور میں سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔ بھئی پریشانی سہنے سے تو کم نہیں ہوتی۔ ایک بار بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو اُن کی فکریں بھی بڑی ہو جاتی ہیں۔

اور دوریاں ہوں تو دل میں کئی وسوسے آتے ہیں۔ اچھے خیال تو آتے ہی نہیں۔ بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ صبح کے چار بج گئے ہیں۔

کوئی نہ کوئی بچہ ضرور پریشان کرتا ہے۔ آج کل افی کی وجہ سے بہت پریشانی ہے۔ امریکہ میں کورونا کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ خصوصاً نیویارک میں۔ عرفان ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے فرنٹ لائن پر ہے۔ اللہ اس کو محفوظ رکھے۔ عدنان کے ساتھ تو ما ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھ لیتے ہیں۔ پتہ نہیں افی کا بچہ شادی کب کرے گا۔

۳۰ مارچ

آج اکا دن بھی روز جیسا ہی ہے۔ روز ہی چھٹی ہے تو کوئی بھی دن ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو گھر میں بند کر لیا ہے۔ شکر ہے گھر میں اتنی جگہ ہے کہ اوپر بور ہوں نیچے چلے جائیں۔ یہ فکر بھی نہیں ہے کہ کھائیں گے کہاں سے۔ اُن کا خیال آتا ہے جو ایک دن نہ کمائیں تو

کھانے کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ بیمار ہو تو علاج نہیں کرا سکتے۔ ہم ان سہولتوں کو کتنا آسانی سے لیتے ہیں جیسے ساری دنیا ایسے ہی چلتی ہے۔ اب شاید لوگ سوچیں کہ اتنی ناانصافی کے ساتھ یہ دنیا نہیں چل سکتی۔ شاید یہ یاددہانی بہت ضروری تھی۔

دوپہر کو نادیہ مظفر نے ایک میسج نے حیران کر دیا۔ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ مظفر کیسے اتنی بڑی حماقت کر سکتا ہے کہ بوریا بستر لپیٹ کر کہیں اور چلا جائے۔ اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر کوئی اور دنیا بسا لے۔ کیسے ہو گیا یہ۔

ستمبر میں تو ہم گئے تھے لندن۔ یہ احساس بھی نہ ہوا کہ دونوں میں کچھ اختلافات ہیں۔ بظاہر ہر چیز نارمل تھی۔ جیسے ایک ہنستے بستے گھر میں ہوتی ہے۔

ہاں میں یہ ضرور محسوس کرتی تھی کہ نادیہ پر کام کا بہت بوجھ ہے۔ صبح سب سے پہلے اٹھتی ہے آخر میں سوتی ہے۔ بچوں کی تیاری، اسکول چھوڑنے اور ناشتے سے فارغ ہو کر پھر اپنے گھر کا کام۔ ہارون کے لیے کان کے ڈاکٹروں سے اپائنٹمنٹ لیتا لے جانا۔ بچوں کو واپس لانا۔ کھانا کے انتظام سب کچھ وہ کرتی اور بڑی خندہ پیشانی سے کرتی ہے۔ اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی ہمیں اندازہ بھی نہ ہوا۔ شاید ایسی بات بھی کوئی نہ ہو۔ پھر اکتوبر میں وہ سب لوگ مظفر کے بیمار والد کو دیکھنے آئے جو نہایت ہی کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ مظفر کو بہت شاک ہوا اور ایک احساس جرم بھی۔ ہارون کہتے ہیں کہ وہ سخت ڈپریشن میں چلا گیا اور پھر جو کچھ ہوا اُس پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ بہر حال ہم دونوں بہت پریشان رہے۔

دونوں سے بات کی۔ عرفان سے بھی بات کی۔ دنیا بند ہے۔ جہاز، ٹرین سب کچھ بند ہیں ورنہ شاید ہم چلے جاتے۔ ہمیں وہ اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں اور وہ بھی ہم سے بہت قریب ہیں۔ کیا یہ بگاڑ کبھی ٹھیک ہوگا؟ مجھے لگتا ہے کہ وقت بڑا مرہم ہے۔ جتنی جلد مظفر لوٹ آئے گا معاملات پہلے جیسے نہیں تو بہتر ضرور ہو سکتے ہیں۔ بہر حال ہم اپنی کوشش تو کریں گے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اچھا نہیں لگا سب کچھ۔

مظفر کی ماں بھی بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے گیند ہماری کورٹ میں ڈال دی ہے۔ میں تو کچھ نہیں کر سکتی سوائے دعا کرنے کے۔ آپ لوگ ہی کر سکتے ہیں وہ آپ لوگوں کو مانتا ہے۔ ارے بھئی لاکھ مانے مگر یہ عشق (یا ہوس) کا بھوت جب سر چڑھ جاتا ہے تو سب پیچھے رہ جاتا ہے۔

آصف فرخی

موراکامی کی نئی مصروفیت

بحران کے ان دنوں میں کون کیا کر رہا ہے؟ عالم گیر وبا سے حفاظت کی غرض سے دنیا بھر کے ایک بڑے حصے میں جاری تالا بندی کے دوران بڑے ادیبوں کی سرگرمیاں بھی خبر بن گئی ہیں۔ کینیڈا سے تعلق رکھنے والی مارگریٹ ایٹ وڈ نے اپنی روزمرہ مصروفیات کے بارے میں ایک جریدے میں شائع ہونے والے روزنامچے میں لکھا کہ وہ دیوار کے ساتھ سیڑھی لگا کر اپنے مکان کی چھت میں ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کر رہی ہیں۔ اس میں ذکر بھی تھا کہ ان کے کئی دہائیوں پرانے جیون ساتھی (پارٹنر) کچھ عرصے پہلے انتقال کر گئے ہیں اور اس طرح کے کام کے لیے وہ اکیلی رہ گئی ہیں۔ جاپان کے مشہور ناول نگار ہاروکی موراکامی کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ وہ ریڈیو کے ایک خصوصی پروگرام کے میزبان بن جائیں گے۔ اس پروگرام کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ تالا بندی کے اس دور میں اپنی قوم کے لیے خوش گوار جذبات ابھار سکیں کیونکہ لوگ بہت پریشان ہیں۔

جاپان کے اس شہرۂ آفاق ناول نگار کا نام اس حوالے سے خبروں کی زینت بنتا رہا ہے کہ اسے ادب کا نوبیل انعام اب ملا ہی ملا۔ لیکن اس بات پر بھی بہت قیاس آرائی ہوتی رہتی ہے کہ یہ انعام اسے اب تک کیوں نہیں ملا؟ بہرحال، موراکامی موسیقی کا دل دادہ ہے، خاص طور پر جاز۔

گارجیئن اخبار کی تفصیلی خبر میں بتایا گیا ہے کہ یہ پروگرام دو گھنٹے کا ہوگا۔ موراکامی اپنی پسند کے گیت سنوائے گا اور سامعین کے سوالوں کے جواب بھی دے گا۔ اس خاص پروگرام کا نام ''گھر میں رہو'' رکھا گیا جو ٹوکیو کے گورنر کی اس اپیل سے لیا گیا ہے جس میں انہوں نے شہریوں سے درخواست کی ہے کہ گھروں کے باہر نہ نکلیں۔

موراکامی نے اس بارے میں لکھا کہ مجھے امید ہے کہ موسیقی کی طاقت کورونا سے پیدا ہونے والی ''بلیوز'' (اداسی کی ترنگ) کو کسی حد تک کم کر دے گی جو جمع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

جاپان میں مئی کے آخر تک کورونا کی یہ ہنگامی صورت جاری رہے گی اور بعض اعلیٰ افسران کا کہنا ہے کہ مریضوں کی تعداد نہ بڑھی تو شاید بعض پابندیاں اس سے پہلے نرم کر دی جائیں۔

موسیقی سے موراکامی کی گہری دل چسپی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی رہی ہے کہ اس نے ۲۰۱۸ء سے ریڈیو پر مختلف پروگرام ٹوکیو ایف ایم کی نشریات کے لیے تیار کیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دس ہزار سے زیادہ فن پاروں کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ ان ہی میں سے منتخب چیزیں اس کے پروگراموں میں سنوائی گئیں..... جاز سے اس کی دل چسپی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنی بیوی یوکو کے ساتھ مل کر ایک جاز کلب بھی کھولا جو سات برس تک جاری رہا۔ موراکامی کو ورزش اور دوڑنے کا بھی بہت شوق ہے اور ورزش کے دوان موسیقی سنتا رہتا ہے۔

موراکامی نے کچھ عرصہ پہلے قارئین کو مشورے دینے کا سلسلہ بھی اخباری کالم کے طور پر شروع کیا تھا جو اس کی ویب سائٹ پر چلتا رہا۔ یہ کالم اور ریڈیو پروگرام ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنے پڑھنے والوں سے رابطہ چاہتا ہے حالانکہ اسے مردم بیزار اور تنہائی پسند سمجھا جاتا ہے۔

موراکامی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔ روشنی تک پہنچنے کے لیے آپ کو اندھیرے سے گزرنا پڑتا ہے۔ کون جانے وہ اس اندھیرے کا بیان اپنی کس کتاب میں کس طرح کرے گا؟

رودریگو گارسیاں
ترجمہ: آصف فرخی

اپنے والد گابرئیل گارسیا مارکیز کے نام ایک خط

گابو،

۱۷ اپریل آپ کی چھٹی برسی کی تاریخ تھی، دنیا اسی طرح چلی جارہی ہے جیسے کہ ہمیشہ سے چلتی آئی ہے اور لوگ اسی طرح حیران کردینے والی تخلیقی سفا کی، اعلیٰ وارفع سخاوت اور قربانی اور ان کے درمیان ہر طرح کی معمول کے ساتھ زندگی گزارتے چلے آرہے ہیں۔

ایک بات نئی ہے: عالم گیر وبا۔ اس کا ماخذ، جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا ہے، کھانے پینے کی اشیا کے ایک بازار میں تھا جہاں ایک وائرس نے ایک حیوان سے انسان تک چھلانگ لگائی۔ ایک وائرس کے لیے چھوٹا سا قدم مگر اس کی نوع کے لیے بہت بڑی جست۔ یہ ایسی مخلوق ہے جو وقت کی ایک ناقابل تفہیم مدت میں ارتقا پذیر ہو کر وہ چھوٹا سا بلا خوار عفریت بن گیا جو آج اس کی حیثیت ہے۔ لیکن شاید اس کا ذکر ان الفاظ میں کرنا غیر منصفانہ ہے اور اگر میرے الفاظ اسے برے لگے تو مجھے شرمندگی ہے۔ اس کو دراصل نام سے کوئی بغض نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو حاصل کرلیتا ہے، کیے جاتا ہے، اس لیے کہ وہ ایسا کرسکتا ہے۔ یقیناً ایسی کیفیت سے ہم بھی گزر چکے ہیں۔ یہ کوئی ذاتی بات نہیں۔

کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب مجھے آپ کے ناول ''ہیضے کے دنوں میں محبت'' کا حوالہ نہیں ملتا یا اس کے عنوان کی بدلی ہوئی شکل یا پھر ''تنہائی کے سو برس'' میں بے خوابی کی عالم گیر وبا کا حوالہ۔ یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ آپ نے ان معاملات کو کس طرح دیکھا ہوتا۔ آپ کو ہمیشہ وباؤں سے دل چسپی رہی، چاہے وہ حقیقی ہوں یا ادبی تخیل کا حصہ، اور ان کے ساتھ ساتھ ان چیزوں سے اور لوگوں سے جو لوٹ کر آتے ہیں۔

آپ اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے جب ہسپانوی فلو پورے کرّے کو تاراج کررہا تھا مگر آپ ایسے گھر میں پروان چڑھے جہاں کہانی کہنے کی روایت راج کرتی تھی اور جہاں وبا، بھوت

اور پچھتاوے کی طرح عمدہ ادبی مواد بن سکتی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ لوگ بہت پرانی باتوں کا ذکر اس طرح کرتے تھے یہ تب کی بات ہے جب دم دار ستارہ سامنے آیا تھا، اور غالباً اس طرح پہلے کے دم دار ستارے کی بات کرتے تھے جو بیسویں صدی کے اوائل میں سامنے آیا۔ مجھے یاد ہے کہ آپ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے کس قدر بے چین تھے جب یہ ہزاریے کے اختتام کے قریب دوبارہ نظر آیا۔ اس نے آپ کو مسحور کردیا، ایک پُراسرار گھڑی جو ہر ۷۵ سال کے بعد خاموشی کے ایک لمحے کا وقت بتاتی ہے، ایک دائرہ جو تقریباً اس مدت کے مساوی ہے جو انسانوں کو عطا کی گئی ہے۔ محض اتفاق؟ شاید ایک اور سُرخ رنگ کی ہیرنگ۔ آپ ملحد تھے۔ مگر آپ اس پر بھی غور کیا کرتے تھے کہ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ کوئی مکمل لائحہ عمل نہیں ہے، نہ یاد رکھنے والا؟ کہانی سنانے والا کوئی نہیں۔ اس بارے میں اب آپ کے پاس اس سے زیادہ بصیرت ہے، جتنی اس وقت میرے پاس ہے، شاید۔

ایک عالم گیر وبا واپس آگئی ہے۔ سائنس کی ترقی اور ہماری نوعِ انسان کی ذہانت کے باوجود، ہمارے لیے بہترین دفاع یہ ہے کہ کمروں کے اندر رہیں، خونی شکاری سے چھپ کر غاروں میں پناہ لیں۔ یہ شرمندہ کردینے والا لمحہ ہے، ان کے لیے جن کا جھکاؤ عاجزی کی طرف ہے۔ باقی لوگوں کے لیے یہ ایک اور مصیبت ہے جو تباہی بن کر آگئی ہے۔

دو ممالک جو آپ کو بہت عزیز تھے ہسپانیہ اور اطالیہ سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ملکوں میں سے ہیں۔ آپ کے سب سے زیادہ پرانے دوستوں میں سے چند بارسیلونا، میڈرڈ اور میلان کے ان ہی فلیٹوں میں گزارا کررہے ہیں جہاں آپ اور مرسیڈیز کئی دہائیوں میں بے شمار بار جاچکے ہیں۔ میں نے اس نسل کے کئی لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ زندہ رہنے کے لیے تلے بیٹھے ہیں، اگر اور کچھ نہیں تو اس وجہ سے کہ وہ فلو سے مارے جانے سے بچ سکیں جب کہ وہ اتنے عرصے سے کینسر، آمرانہ حکومتیں، ملازمت، ذمہ داری اور شادی کو جھیل چکے ہیں۔

یہ صرف موت نہیں جو ہمیں ڈرا دیتی ہے، بلکہ اس کے حالات۔ ایک آخری الوداع خدا حافظ کہے بغیر، ساتھ میں بس اجنبی لوگ جو غیر زمینی مخلوق کے لباس میں ہیں، مشینیں سنگ دلی سے آوازیں نکال رہی ہیں، چاروں طرف ایسے افراد جو ان ہی حالات میں مجبور ہیں، مگر اپنے لوگوں سے دور۔ آپ کو جس بات کا سب سے زیادہ خوف تھا، تنہائی۔

آپ اکثر ڈینیل ڈیفو کے ''طاعون کے سال کا روزنامچہ'' کا ذکر کیا کرتے تھے کہ آپ کہ

سب سے زیادہ گہرا اثر ڈالنے والی کتابوں میں سے ہے مگر کل تک میں یہ بھول بیٹھا تھا کہ آپ کی پسندیدہ ترین کتابوں میں سے پسندیدہ ''اڈیپس ریکس'' ایک بادشاہ کی ان کوششوں کے گرد قائم ہے کہ کسی طرح وبا کو ختم کردے۔

یادوں میں اس بادشاہ کی قسمت کی الم انگیز ستم ظریفی سب سے آگے ہے مگر اصل میں تو وبا تھی جس نے ان قوتوں کو مہمیز دیا جنھوں نے اسے آخری انجام تک دھکیل دیا۔ آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وباؤں کے بارے میں جو بات آسیب بن کر ذہن پر حاوی رہتی ہے، یہ ہے کہ وہ ہماری ذاتی و انفرادی تقدیر کی یاد دلاتی ہیں۔ تمام تر حفاظتی تدابیر طبی سہولیات، عمر اور مال دولت کے باوجود، کسی کے نام وہ بدقسمتی کا قرعہ نکل سکتا ہے۔ قسمت اور موت، بہت سے ادیبوں کے پسندیدہ موضوعات۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ آج یہاں ہوتے تو ہمیشہ کی طرح آدمی سے سحر زدہ ہوجاتے۔ ''آدمی'' کی یہ اصطلاح آج تک اس طرح سے استعمال میں زیادہ نہیں آتی مگر میں استثنائی طور پر یہ دہراؤں گا۔ پدرشاہی کے آگے سلام کرتے ہوئے نہیں جس سے آپ کو بھی نفرت تھی، بلکہ اس لیے کہ یہ اس ادیب بننے کے خواہش مند نوجوان آدمی کے کانوں میں گونج اٹھے گی جو کبھی آپ تھے، سر میں اس قدر احساسات اور خیالات لیے ہوئے کہ جن سے آپ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرو میں اور اس قوی احساس کے ساتھ تقدیر لکھی ہوتی ہیں، اس مخلوق کی بھی جو خدا کی شباہت میں بنایا گیا اور خودمختاری کا سزاوار ٹھہرا۔ آپ ہماری کمزوری پر ترس کھاتے، آپ ہمارے ایک دوسرے سے مربوط ہونے پر عش عش کر اٹھتے، تکلیف پر افسردہ ہوتے، بعض رہنماؤں کی سنگ دلی پر غضب ناک ہوجاتے اور ہراول دستوں کی ہمت اور بہادری سے متاثر ہوجاتے۔ اور آپ یہ جاننے کے مشتاق ہوتے کہ نوجوان عشاق کس طرح ہر رکاوٹ کا سامنا بہادری سے کر رہے ہیں جن میں موت کا خطرہ بھی شامل ہے، صرف اس لیے کہ ساتھ رہ سکیں سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ انسانوں کو اتنے ہی پیارے ہوتے جتنے کہ ہمیشہ رہے ہیں۔

چند ہفتے پہلے، گھر میں محبوس رہنے کے ابتدائی دنوں میں، میرا سر اس کوشش میں چکرائے جارہا تھا کہ اپنے آپ کو سمجھا سکوں اس سب کے معنی کیا ہیں، یا پھر اس سے نکلے گا کیا۔ میں ناکام رہا۔ دُھند بہت گہری تھی۔ اب معاملات زیادہ معمولی ہوتے جارہے ہیں، جیسے کہ تمام معاملات آخرکار ہوجاتے ہیں، ہولناک ترین جنگوں میں بھی، اس کے باوجود میں اس سب کو کسی اطمینان بخش

طریقے سے میٹ لینے سے قاصد ہوں۔

بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ زندگی اب پہلے کی طرح نہیں رہے گی۔ اس کا امکان ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ بڑی بڑی تبدیلیاں لے آئیں گے، زیادہ تر تھوڑی سی تبدیلیاں مگر مجھے شک ہے کہ زیادہ تر لوگ پہلے والے ناچ کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ کیا یہ ایک اچھی دلیل نہیں ہے کہ یہ عالم گیر وبا اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی حیران کُن طریقوں سے غائب ہو جاتی ہے اور ہمیں بھرپور طریقے سے اور ابھی زندہ رہنا چاہیے۔ آپ کے پوتوں میں سے ایک نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔

نقل و حرکت پر پابندیاں بعض جگہوں پر نرم پڑتی جا رہی ہیں اور تھوڑا تھوڑا کر کے یہ دنیا باہر نکل کے معمول پر آنے کی کوشش کرے گی۔ ناگزیر آزادی کے دن کے سپنے بھی بعض لوگوں کو یہ فراموش کرا دیتے ہیں کہ انھوں نے دیوتاؤں سے کیا وعدے کیے تھے۔ ہماری ذات کی اندرونی اور گہری سطح بلکہ پوری نوعِ انسان حال ہی میں اس عالم گیر وبا کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش ماند پڑتی جا رہی ہے۔ ہم میں سے جو لوگ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہوا، ہم میں سے بہت سے اس کی تفہیم اپنی پسند کے مطابق کرنا چاہیں گے۔ ابھی سے یہ حال ہے کہ ''خریداری'' سب سے پسندیدہ سکون آور دوا کے طور پر عظیم الشان واپسی کے لیے تُلی بیٹھی ہے۔

میں ابھی تک دُھند میں ہوں۔ اس وقت یوں لگتا ہے کہ مجھے ''ماہرینِ فن'' کا، چاہے زمانۂ حال کے ہوں یا استقبال کے، انتظار کرنا پڑے گا کہ اس مشترکہ تجربے کو تحلیل کرنے میں مدد دیں۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔ کوئی گیت، کوئی نظم، کوئی فلم یا ناول آخرکار مجھے اس عمومی راستے کی طرف اشارہ کر کے دکھا دے گا جہاں اس تمام سلسلے کے بارے میں میرے خیالات اور جذبات دفن ہیں۔ جب میں وہاں پہنچ جاؤں گا تو مجھے مٹّی ہٹانے کے کام کا کچھ حصّہ خود کرنا پڑے گا۔

اس دوران یہ سیارہ گردش کیے جا رہا ہے اور زندگی اسی طرح پُراسرار، طاقت ور اور حیران کُن ہے۔ بلکہ جیسے آپ کم اسمائے صفت اور زیادہ شاعری کے ساتھ کہا کرتے تھے، زندگی کو کوئی کچھ سکھا پڑھا نہیں سکتا۔

رودریگو

قلم کار

انتظار حسین
آدم زاگاجووسکی
اولگا توکارچک
اشوک واجپائی
انعام ندیم
انیس ہارون
اورحان پامک
ایوالپسکا
تنویر انجم
جارج زرنس
جان اڈاناجیو
چانگ یاؤ
دانیال شیرازی
ڈنوشا لیمیرس
ڈاکٹر فاطمہ حسن

ذکیہ مشہدی
زسلاو میووش
سعید نقوی
سلمان ثروت
سید کاشف رضا
سید محمد اشرف
شہلا نقوی
عثمان قاضی
عشرت آفرین
فرح ضیاء
فلپ لارکن
کئی اومیارہ
کشور ناہید
کلدیپ کمار
گونیکیلو ایم۔ ٹیوریس

لیلا دھر منڈلوئی
مارگریٹ ایٹ وڈ
مانگ اے
محمد حمید شاہد
مسعود اشعر
منیب الرحمٰن
ناصر عباس نیّر
نجم الدین احمد
ندیم اقبال
نورالہدیٰ شاہ
نیلیم کمار
وجے کمار
وینڈی کوپ
ہوانگ خان
یووال نوح ہریری